# TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224297
UNIVERSAL
LIBRARY

# Osmania University Library

Call No. ۸۹۱٫۴۳۰۹ Accession No. ۱۴۹۹۱

۲ - خ

Author خیال - نصیر حسین خان

Title

This book should be returned on or before th[e date last]
marked below.

# داستانِ اُردو

ادیبِ اعظم نواب نصیر حسین خاں صاحب

اِدارۂ اشاعتِ اُردو
حیدرآباد (دکن)

قیمت ایک روپیہ

# پیش لفظ

U.169

**خاندانی حالات** ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال ہماری زبان کے وہ بے مثیل اور صاحب طرز ادیب ہیں جن پر خود اردو زبان کو ناز ہے۔ نواب خیال خاندانی رئیس تھے آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے ایران آئے اور وہاں بڑا رسوخ حاصل کیا اور رفتہ رفتہ اقتدار اتنا بڑھا کہ ان کا خاندان اعلیٰ مراتب پر پہنچے۔ اس کے بعد اس خاندان نے ہندستان جنت نشان کا رخ کیا یہاں بھی قسمت ساتھ آئی اور عظمت و وجاہت ہمرکاب رہی۔ اس وقت ہندستان پر مغل حکمران تھے اس خاندان کی خوب عزت ہوئی کئی افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور بے مثیل ترقی کی۔ اسی خاندان کے دو بھائی قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علیخاں "بادشاہ گر" کہلائے۔ ایک عرصہ تک سلطنت کے نظم و نسق میں یہی دونوں بھائی دخیل رہے اور انہی کے مشوروں سے ملک کے کاروبار چلتے رہے۔

امیر الامرا سید حسین علی خاں سب سے پہلے بہار کے صوبہ دار مقرر ہوئے ان کا مستقر عظیم آباد تھا۔ اس صوبہ میں ان کو بادشاہ دہلی کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد حسین علیخاں وزیر ہوئے تو یہ جاگیر ان کے چھوٹے بھائی نواب زین الدین علی خاں کو ملی اور انھوں نے اس تقریب سے بہار میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ نواب زین الدین علی خاں نواب خیال کے پردادا تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے جس سے اس خاندان کے زوال کے

ت نظر آنے لگے تھے لیکن نواب علی وردی خاں مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کے تعلقات اور رشتہ داری سے اس خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اس خاندان کی عظمت برقرار رہی۔

نواب خیال کا خاندان ہمیشہ سے اردو کا سرپرست رہا ہے۔ دلّی جب مٹی تو صوبہ بہار باکمالوں اور ہنروروں کا مسکن تھا۔ اس خاندان نے دلی کے باکمالوں کی اچھی قدر کی اور ان کی قدر دانی نے عظیم آباد کو دلی بناکر چھوڑا۔ یہاں اردو کو اس قدر ترقی ہوئی کہ شعر و شاعری کا ایک علٰحدہ اسکول قایم ہوگیا۔ نواب ہدایت علی خاں آسد جنگ ثبیر اوران کے فرزند نواب غلام حسین خاں (مصنف سیرالمتاخرین) اسی خاندان کے افراد ہیں۔ یہ دونوں حضرات بھی اُردو کے بڑے سرپرست اور مربی تھے۔

غرض اسی خاندان میں جو امارت و وجاہت اور علم و فضل کے اعتبار سے ہندستان میں مشہور تھا نواب نصیر حسین خاں خیال ۱۸۷۸ء میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے! امراو روسا کی طرح گھر میں تعلیم پائی اردو کا کیا ذکر یہ تو گھر کی لونڈی تھی۔ عربی فارسی میں اچھی استعداد تھی۔ انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔ فرانسیسی سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے طبیعت مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئی قدرت نے موزوں دل و دماغ عطا کیا تھا چند ہی روز میں چمک گئے۔

## نواب خیال کی مضمون نگاری

ابتدا میں رسالہ حسن حیدرآباد میں فرضی نام سے مضمون لکھتے رہے ۱۸۹۶ء میں جب مشہور نثر نگار علی سجاد نے عظیم آباد سے رسالہ ادیب جاری کیا تو آپ اس رسالہ میں مضمون لکھنے لگے۔ آپ کی زباندانی اور ادب کو دیکھ کر سرسید اور عبدالحلیم شرر نے بڑی تعریف کی تھی۔ علی سجاد کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ نواب خیال ابھی نوعمر ہی تھے کہ اردو کے بڑے ہوشمند انشا پرداز سمجھے جانے لگے۔

۱۸۹۹ء میں آپ کی شادی کلکتہ میں انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ وزیر شاہ اودھ کی دختر سے ہوئی اور اس تعلق سے آپ نے عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

کلکتہ آنے کے بعد مضمون نگاری کا شوق بہت بڑھا۔ ملک کے مختلف رسائل میں مضمون لکھنے لگے۔ آپ کے اکثر مضامین ارژنگ کے نام سے شایع ہوئے ہیں آپ کے مضامین بہت دلچسپی سے پڑھے جانے لگے۔ مدیران رسائل و اخبارات کی طرف سے فرمائشیں شروع ہوئیں۔ غالباً ۱۹۰۶ء میں مولانا ظفر علی خاں کی فرمائش پر "مرثیہ اور مرزا دبیر" کے عنوان سے ایک بہت ہی جامع مضمون لکھا جو دکن ریویو کے کئی نمبروں میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون پر نواب کے تنقیدی مطالعہ اور قوت تحریر کی بڑی ستایش کی گئی آپ کا ایک بہت ہی مشہور مضمون "خالاؤں کا مارا آغا" ہے جو ۱۹۱۳ء میں رسالہ ادیب الہ آباد کے کئی نمبروں میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت نے زبان اور طرز نگارش کا پایہ بہت بلند کر دیا۔ اس کے علاوہ نواب خیال نے بہت سے متفرق مضامین لکھے اور لاجواب انشا پردازی کی وجہ سے سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کیا جن رسائل میں آپ کے مضامین شایع ہوئے ہیں ان کے چند نام یہ ہیں۔

حسن حیدرآباد۔ ادیب عظیم آباد۔ العصر الہ آباد۔ اولڈ بوائے علیگڈھ علیگڈھ میگزین۔ دکن ریویو حیدرآباد۔ سہیل علیگڈھ۔ نقیب بدایون۔ نوائے کیمبرج۔ جادو ڈھاکہ۔ آفتاب کلکتہ۔ شمس کلکتہ۔ ندیم گیا۔

## نواب خیال کے سیاسی شاغل

آپ کی کوئی مستقل کتاب شایع نہیں ہوئی داستان اردو کے نام سے ایک بسیط کتاب لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے۔ یہ کتاب بھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی البتہ اس کے بعض اجزاء رسائل میں شایع ہوئے ہیں اس کا ایک حصہ مغل اور اردو کے نام سے

چھپ گیا ہے۔ شاہنامہ فردوسی پر آپ نے ایک طویل تنقیدی مضمون لکھا تھا جو بصورت کتاب شایع ہوا ہے۔ مرثیہ گویوں کا ایک تذکرہ لکھ رہے تھے لیکن موت نے اس کی تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ گارساں دتاسی کے فرانسیسی تذکرۂ شعرائے اردو کا ترجمہ کر رہے تھے لیکن یہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ جب اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے صدر منتخب ہوئے اور اس موقع پر آپ نے جو خطبہ سنایا تھا وہ آپ کی ضخیم تصنیف داستان اردو کا مکمل خلاصہ تھا۔ اور وہ یہی مقالہ ہے جو پیش خدمت ہے۔ یہ مقالہ نواب کی ادبی پیداوار میں شہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ اپنے موضوع کی حد تک مکمل اور ہزاروں صفحات کا نچوڑ ہے۔

علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ نواب خیال قومی معاملات میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ مسلم لیگ میں شریک رہ کر آپ نے بڑی سرگرمی سے قومی خدمت انجام دی ایک حیثیت سے اگر آپ کو لیگ کے بانیوں میں شمار کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد مسلمانوں کی حیات سیاسی سے تعلق رکھنے والے مسایل کو سلجھانے اور سمجھانے کے لئے بمقام شملہ لارڈ منٹو کی خدمت میں باریاب ہوا تھا نواب صاحب بھی اس وفد کے خاص رکن تھے اور اس موقع پر مسلمانوں کی پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ نمایندگی کی تھی۔ آپ کی کوششوں سے مسلم لیگ کی ایک شاخ غالباً ۱۹۰۸ء میں بنگال میں قایم ہوئی۔ نواب خیال کو سیاسی معاملات کے علاوہ تعلیمی امور سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ طلبہ کے بڑے ہمدرد تھے اور ان کی بڑی مدد کیا کرتے تھے۔ نواب خیال نے ڈسمبر ۱۹۳۲ء عیسوی میں وفات پائی۔

## نواب خیال کی طرز نگارش

اب ہم نواب خیال کے حالات زندگی مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد اس مقام پر آگئے ہیں جو نواب کا اصلی مقام ہے اور اسی نے نواب کے نام کو زندہ رکھا ہے اور زندہ رکھے گا اور جب تک اردو زبان دنیا میں موجود ہے نواب کا نام ایک بے مثل ادیب کی حیثیت سے لیا جاتا رہے گا۔

نواب خیال ایک خاص طرز تحریر کے مالک تھے۔ اب تک اس طرز میں لکھنے والا کوئی دوسرا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ نواب کی انشاء پردازی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ مضمون کے لئے آپ جو موضوع تلاش کرتے ہیں اس موضوع کی فطرت کے عین مطابق الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور یہی ترتیب مضمون میں جان پیدا کر دیتی ہے۔ نواب کی تحریر میں یہ بڑی خاص چیز ہے۔ بغیر حسن ترتیب کے آپ کتنے ہی خوبصورت الفاظ اپنے مضمون میں جمع کیجئے نہ اس میں دلکشی پیدا ہوتی ہے نہ گھلاوٹ۔ برخلاف اس کے یہی فطرت شناسی اور احساس توازن نواب خیال کی تحریر میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نواب خیال جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو زبان کا استعمال اس کے مطیع ہو کر نہیں بلکہ اس پر قادر و قابض ہو کر کرتے ہیں۔ نواب خیال کی عبارت میں آپ سادگی کے باوجود بلا کا بانکپن اور غضب کی شوخی پائیں گے جس سے پڑھنے والا گرویدہ ہو جاتا ہے اور نواب کا قلم ہے کہ بے تکلف روانی کے ساتھ بیل بوٹے اُتارتا چلا جاتا ہے اور قاری پر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے اور خاص صفت یہ ہے کہ عبارت کا رنگ کسی جگہ بھی پھیکا

ہونے نہیں پاتا۔

نواب خیال کے مضمون کو پڑھنا شروع کیجئے۔ آپ ہر جگہ فکر و نظر کی جولانیاں دیکھیں گے۔ ہر فقرہ میں الفاظ کی سحر کاریاں اٹکھیلیاں کرتی نظر آئیں گی، وسعت علم، احساس شعریت اور نزاکت خیال کا امتزاج آپ کو اپنا بنا لیگا عبارت چٹخلی کھائے گی اور انداز بیان پکار اُٹھے گا کہ میرا لکھنے والا فلاں شخص ہے اور یہی نواب خیال کی تحریر کا بڑا کمال ہے۔ ایک مغربی مصنف لکھتا ہے کہ وقعات روزگار تو ہر شخص بیان کر سکتا ہے لیکن ضرورت ایسے شخص کی ہے جو بیان کرنا جانتا ہو۔ نواب خیال اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ آپ کے قلم سے جو تحریر نکلتی ہے حسن بیان کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہو جاتی ہے۔

آج بکثرت اہل قلم پیدا ہو گئے ہیں، ہر شخص لطیف نگاری کا دعویدار ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ بہت ہی کم لوگوں نے انشاء پردازی میں جگہ حاصل کی ہے۔ بے راہروی اور مطلق العنانی آج کل کی انشاء پردازی میں بہت نمایاں ہے۔ طرز نگارش میں کوئی اضافہ ہوا ہے نہ اسلوب بیان میں الفاظ کے غلط استعمال اور بے معنی فقرات کا نام لطیف نگاری رکھا گیا ہے۔

**داستان اردو کی اشاعت** داستان اردو کے نام سے نواب خیال کا جو مقالہ شائع کیا گیا ہے وہ انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں زبان اردو کی تاریخ بہت ہی لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں عبارت کی دلاویزی اور انداز بیان کی سحر کاری کے ساتھ

استعداد و فکر اور تاریخی معلومات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اور ہند و مسلم تعلقات پر اپنے وسعت علم اور حکیمانہ نظر سے اس قدر اچھے انداز میں نظر ڈالی ہے کہ بے اختیار کلماتِ تحسین نکلتے ہیں۔ یہ بھی وقت کی بڑی ضروری چیز ہے۔

اس سلسلہ میں ہم یہ ظاہر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں کہ نواب خیال کے دیگر علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے بہت سے مضامین فراہم ہو چکے ہیں۔ اس بارے میں اربابِ علم و ادب سے اور خصوصاً نواب خیال کے عزیز و اقارب سے گزارش ہے کہ ان کے پاس نواب صاحب کے جس قدر مضامین ہوں وہ ازراہ کرم ہمارے پاس بھیجدیں۔ اگر وہ چاہیں تو اشاعت کتاب کے بعد ہم ان کے مضامین بہ حفاظت تمام شکریہ کے ساتھ واپس بھیجدیں گے۔

---

(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری

# داستانِ اردو

## بنام[1] ایزد بخشایندہ بخشایش گر مہربان دادگر!

عجائبات دنیا[2] میں سے عجیب تر اس کا وہ حصۂ ارضی ہے جسے ہم آریاورت[3] یا ملک ہند[4] کہتے ہیں۔ اس زمین کی ہمیشہ سے یہ شان رہی کہ اس کا کوئی خطہ اور ٹکڑا کسی ایک قوم اور کسی ایک نسل سے کبھی بھرا پُرا نظر نہ آیا۔ سارے جہاں کی بوقلمونی اور نیرنگی و رنگینی اسی ایک باغ کے اندر سمٹ کر چلی آئی۔ دور دراز زمینوں کے بیج لا لا کر یہاں ڈالے گئے اور سات سمندر پار کے تازہ قلم یہاں لائے گئے۔ بھانت بھانت کا جانور اس وحش خانہ اور رمنہ میں بولا اور چہکا۔ اُن کے زمزموں نے

---

[1] دساتیر کی بسم اللہ دیکھو۔ دساتیر ملا فیروز پارسی مطبوعہ ۱۸۱۶ء۔ [2] کرۂ ارض [3] آریہ بزرگ۔ ورت مسکن آریہ ورت۔ آریوں کی جگہ [4] ہند اس ملک کو یہ لقب ایرانیوں نے بخشا وہ ادھر آئے تو پہلے سندھ سے سامنا ہوا۔ فارسی عموماً س کو ہ سے بدل دیتے ہیں اس لئے سندھ سے ہندھ ہوا کثرت استعمال سے گری اور ہند ہو گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو ہندو اور ہندی (بیائے نسبتی) کہا اور یہاں کی زبان کو ہندی لقب بخشا۔ ۱۲!

دنیا کے کان کھڑے کر دیئے اور ان آوازوں پر بے چین دل ادھر متوجہ ہو گئے اس باغ کی اسی روش نے اُسے ایسا سدا بہار بنا دیا کہ بیرونی دنیا آج تک اس پر مٹی ہوئی اور یہاں کی خاک سرمہ کش دیدۂ شوق بنی ہوئی ہے!

## نون آرین مہاجرین اور انکی بھاکھا

یہ اسی زمین کی جاں بخش و روح پرور آب و ہوا اور اسی باغ کی گوناگوں رنگینی اور قدرتی شادابی و زرخیزی کا اثر و کشش تھی کہ اُسکے اطراف کی ذی حس و زندہ قومیں اس طرف کھنچ آئیں اور اپنے مسکن اور بوم کو چھوڑ چھوڑ کر یہاں کی خاک سے لپٹیں اور اس پر اپنی پیشانیاں رگڑنے لگیں!

اُن خوش نصیب اقوام میں سے اوّل اوّل جن قوموں نے یہ شرف حاصل کیا وہ تین مختلف نسلوں کی یادگار تھیں جو اس باغ کے تین مشہور دروازوں سے سر جھکا کر یہاں داخل ہوئیں! اول تبتو برمن یہ شمال و مشرق سے ہمالہ کی برفستانی چوٹیاں پھاندتے ہوئے اِدھر آئے اور اب بھی اس کے دامن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دوم کولاریئین یہ بھی اسی راستہ سے بنگالہ میں آ کودے اور پھر دکن کی طرف اُتر آئے جہاں اُن کے نشان ہنوز باقی ہیں۔ سوم۔ ڈرویتین۔ جو شمال و مغرب (باب الہند) سے پنجاب میں آ نکلے اور پھر رفتہ رفتہ کنار سمندر کی ہوا کھاتے اور کتراتے ہوئے انتہائی دکھن یعنی کیپ کومرن تک جا پہنچے اور وہاں پھیل گئے۔ تاریخی امتیاز کے لئے اُن کا نام نون آرین (غیر از آرین) رکھا گیا اور وہ پردیسی یہاں آ کر اپنے گھر کی طرح رہنے سہنے لگے۔

نون آرین قوماً اور صورتاً وسیرتاً ایک دوسرے سے بالکل بیگانہ ومختلف تھے
ان کے رسم ورواج، عادات وخصائل آپس میں ملتے ہوئے تھے اور زبان ومذہب
(جن کے زور سے مختلف النسل قومیں ایک اور متحد ہو جاتی ہیں) کے سخت افتراق نے
انہیں کبھی باقوت ہونے نہ دیا اس وجہ سے کسی غیر قوم کے حملہ کے وقت کوئی زور اور
قوت نہ دکھا سکیں اور آخر فنا یا بن باسی ہو کر دنیا کی نظروں سے غائب اور اوجھل ہوگئیں
شروع شروع میں جیسا کہ قاعدہ ہے یہ قومیں اپنی دیسی اور ملکی زبانیں (تبتی
پہاڑی کولاری۔ تاتاری) بولتی تھیں لیکن یہاں آکر ان کے اطوار وتہذیب کی طرح
وہ زبانیں بھی بدلیں اور صاف ہوئیں اور وہی اُن کی مختلف بھاکھا[3] اور پراکرتیں[4]
کہلائیں۔ یہ زبانیں کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں اور گو وہ شاخ در شاخ ہو کر ٹوٹ
ٹوٹ گئیں لیکن ایک ماہر علم اللسان اب بھی اسکی اصل تبا کر اُن کی جڑ بنیاد اور قومیت
کی خبر دے سکتا ہے۔

# آرین اور سنسکرت

یہ نون ایرین ابھی اس باغ کی بہار دیکھ رہے اور اس زمین کی ہوا ہی کھا
رہے تھے کہ اُدھر وسط ایشیا کے پلیٹو سے ایک سورما قوم اٹھی جس نے اپنے تواے دماغی

---

[1] یہاں کے جنگلوں اور کھوؤں میں جو قومیں مثل بھیل کول۔ سینڈا او سنتالی وغیرہ وغیرہ نظر آتی
اور وہ خانہ بدوش جو اکثر جاڑوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ یہاں کی پُرانی قوموں کی نشانیاں
اور یادگار ہیں۔ [2] دیکھو تاریخ ہند از سرجان اسٹریچری و تاریخ ہند و اہل ہند از ڈاکٹر ہنٹر اور
اور تاریخ فرشتہ وغیرہ وغیرہ۔
[3] بھاکھا۔ بول۔ زبان۔ [4] پراکرت۔ عوام کی زبان۔

وطاقت جسمانی کی بدولت اس وقت کی دیگر قوموں پر شرف پایا۔ ان میں کے ایک گروہ نے مغرب پر ہاتھ ڈالا اور دوسری جماعت نے اس باغ کی آرائش کا حال سن کر ادھر قدم بڑھایا۔ یہ نئی قوم جس نے خطۂ آری نا (ایران) سے سر نکالا اور اس لئے آرین لقب پایا تھا اسطرف بڑھی[1] اور پنجاب کو تسخیر کرکے وہاں ڈیرہ ڈالا اور پھر رفتہ رفتہ ایک اچھے حصۂ ہند پر قابض و متصرف ہوگئی۔

نون ایرین جو زبانیں بولتے اور جن بھاکھا میں اظہار مطالب اور تبادلۂ خیالات کرتے تھے وہ مختلف تھیں اور جس طرح وہ ٹولی ٹولی اور گروہ گروہ ہوکر یہاں بسے اور آباد ہوئے اور تمدن و معاشرت میں ایک دوسرے سے بیگانہ و علیحدہ ہوگئے تھے اسیطرح اُن کی زبان کا شیرازہ بھی بکھرا اور خطہ خطہ کی پراکرتیں جُدا جُدا ہوکر اتحاد زبان کا وہ زور جاتا رہا تھا جسکی بدولت کسی گروہ کے تخیلات و مطالب میں یکسوئی و یکجہتی ہوجاتی اور پھر وہ جماعت ایک قوم بن جانے کا شرف حاصل کرلیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ کمزور پڑے اور شہ زور آریوں کے آخر غلام بن گئے۔

بزرگ و پاک[2] آرین نے جب ان ناپاک اور شودر[3] نون آرین پر فتح پائی اور نچنت ہوکر بیٹھے تو اپنے فلسفہ و قانون و مذہب کی تدوین و ترتیب کے ساتھ ساتھ اپنی اُس زبان کی تکمیل و تہذیب کی طرف بھی جھکے جسے وہ اپنے دیس سے ساتھ لائے اور جسے اپنی جان کے برابر سمجھتے تھے۔ یہ وہی زبان تھی جو ان کے اصل وطن میں ژند بولی اور ہند میں آکر سنسکرت سمجھی گئی۔

---

[1] تقریبًا ایک ہزار سال قبل مسیح
[2] آریہ بزرگ خاندانی۔
[3] شودر۔ نیچ ذات۔ گنوار چاکر۔

یہ مقدس[1] زبان (سنسکرت) ان نئے حکمرانوں کی حکومت و اقتدار کیطرح بڑھی اور پھلی پھولی لیکن چونکہ ہمارے یہ مہاتما اپنے سے کم رتبہ انسان اور اپنے پرجا شودروں کے ناپاک منہ میں اپنی پاک زبان کا ڈالنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے اس وجہ سے وہ مختلف پراکرتین جو ان نون ایرین کی زبانیں تھیں اور عرصہ سے یہاں جاری وساری ہو رہی تھیں آزاد رہیں اور سانسکرت کی باندیاں نہ بن سکیں۔ عوام بدستور اپنی زبان کا مزا لیتے اور خواص اپنے ہی زبان کی چاشنی چکھتے رہے۔ لیکن ضرورت کے قانون سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اور اس لئے گو حاکم و محکوم میں گہری چھوت نہ رہی لیکن روزانہ کے کام کاج کی خاطر ایک نے دوسرے کی جانب ہاتھ بڑھا ہی دیا۔

## فارسیین اور ژند[2]

یہ حالت تقریباً چار سو برس تک قائم رہی سنسکرت اپنے عروج و کمال پر پہنچ کر اپنے خالص ہونے کا دعوے بھی کر رہی تھی کہ ان مہاتما آرین کے دوسرے بھائیوں (فارسیوں) نے اس باغ کی بہار لوٹنا چاہی۔ دارا شاہ فارس پنجاب کی طرف بڑھا[3] اور اس پر قبضہ کر کے اپنے زیرنگیں کر لیا۔ یہ نئے حملہ آور امتداد اور دوری کے باعث اپنے دوسرے بھائیوں (ہندی آرین) کو بھول چکے اور اپنا فلسفہ و مذہب الگ قائم کر چکے تھے۔ لیکن زبان وہ سخت جان ہے کہ قوموں اور ملکوں کے مٹ جانے پر

---

[1] سنسکرت مکمل، مقدس دیوتاؤں کی زبان [2] ژند چقماق (چکمک پتھری) کا وہ حصہ جسکی زور اور رگڑ سے آگ نکلتی ہے۔ ایران کی وہ قدیم زبان جو وہاں کی مختلف پراکرتوں کی رگڑ سے شعلہ بنکر نکل آئی اپنے دیس میں وہ گو پرکالۂ آتش تھی مگر یہاں (ہند) آکر طور پر چڑھی اور آخر دیوتاؤں کے منہ میں پڑ کر نور بنی اور پوجی گئی۔ [3] تقریباً چھ سو سال قبل مسیح۔

بھی جلد نہیں مٹتی اور اس کی روح اور اسپرٹ عرصہ تک باقی رہتی ہے اس وجہ سے ان دونوں (فارسی آرین اور ہندی آرین) کی زبانیں جو ایک گھر کی بیٹیاں تھیں۔ تغیرات کے بعد بھی پہچان لی گئیں اور ژند سنسکرت سے اور سنسکرت ژند سے پھر گلے ملنے لپٹنے اور آپس میں شیر و شکر ہونے لگی۔

## بدھ مت اور پالی

زمانہ اب سوا سو برس اور آگے بڑھ آیا۔ اس عرصہ میں ہند و ایران کی دیرینہ دوئی دُور ہو کر یکجہتی کا یہ نیا رشتہ کھل چکا تھا اور سنسکرت اپنی دوسری بہن ژند کی طرح شائستگی و تہذیب کا جامہ پہن چکی اور عزت و افتخار کا خلعتِ فاخرہ پا چکی تھی کہ دفعتاً ملک میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوا جس سے نہ صرف سلطنت اور ہندو دھرم ہی کو سخت دھچکا لگا۔ بلکہ انکی مذہبی زبان سنسکرت نے بھی وہ جھٹکا کھایا کہ پھر پنپ نہ سکی اور جانبر نہ ہو سکی!

سنسکرت سلطنت و مذہب کی زبان تھی اور مذہب کی طرح غیروں کو اس زبان کا مزا چکھنا بھی چھوت اور منع تھا۔ سلطنت و رعایا کے مذہب و معاشرت کے

---

لے سنسکرت و ژند میں کچھ عجیب طرح کا تاریخی اتحاد چلا آتا ہے جس طرح یہاں بودھ نے سنسکرت کو مٹایا اسی طرح وہاں (ایران) ژند کو زرتشت (زردشت) نے خاک سیاہ کیا۔ یہاں پالی آگے بڑھی۔ وہاں پاژند نکلی۔ یہاں پھر سنسکرت ابھری وہاں بھی اردشیر نے ژند کو ابھارا۔ یہاں بھاشا اور برج بھاشا کا دور دورہ ہوا وہاں دری و پہلوی نے اپنا علم نکالا۔ یہاں بھی عربی فارسی نے بھاشا پر اپنا عمل کیا اور آخر اردو کا جھنڈا گڑ گیا۔ وہاں بھی پہلوی پر عربی کا اثر پڑا اور رفتہ رفتہ موجودہ فارسی کا پتلا کھڑا ہو گیا۔

اختلاف کے ساتھ ساتھ زبان کا فرق بھی ایسا حائل ہوا کہ حاکم و محکوم کے ادراک تخیلات اور خواہشات کسی طرح ایک نہ ہو سکے۔ اور آخر (دونوں میں) افتراق و نفاق کا بیج پڑ گیا۔ عوام جن کی تعداد ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہے آہستہ آہستہ ابھرا اور کسی انقلاب کو دل سے چاہ رہے تھے کہ اسی عظیم الشان راج (ہند و سلطنت) کی ایک شاخ اور سورج بنسی چھتریوں کے گھر سے ایک چاند (سدھارتھ) طلوع[1] ہوا جو بڑھ کر منی گوتم بدھ پکارا گیا گوتم جی جہاں کی خاک[2] سے اٹھے تھے۔ وہاں کی پراکرت اور خطوں کی پراکرتوں سے ذرا جدا تھی۔ انہوں نے (بدھ) نے اپنی دیس کی زبان اختیار کی اور عوام کے چوٹ کھائے ہوئے دلوں کو یوں ہاتھ میں لیکر ان ہی کی بھاکھا میں اپنا وعظ شروع کیا۔ اسی منی (عاقل و فرزانہ) کی زبان نے پالی لقب پایا۔ یہ وہی بھاکھا تھی جس میں اُس (بودھ) نے ایک عالم وجد و سُرور میں (کاشی اور گیا جی کے جنگلوں کے درمیان) اپنے ساتھیوں اور چیلوں کو پکارا اور کہا کہ "دھرم کرو، دھرم کرو، دھرم کا سنکھ پھونکو، دھرم کی ڈونڈ مچاؤ!!"

ان اچھوتے اور نادر فقروں پر غور کرو اور اب انہیں پالی کہو یا پُرانی بھاشا لقب دو یا ڈھائی ہزار برس کی اردو سمجھو اور آج کون ہے جو ان فقروں کے الفاظ اور مطالب کو نہیں سمجھ سکتا اور اُسے فصیح اردو نہیں کہہ سکتا!

غرض یہ زبان (پالی) بدھ مت کے ساتھ آگے بڑھی اور جہاں اگلی سلطنت

---

[1] تقریباً ۷۷، ۴ سال قبل مسیح [2] گوتم بدھ کے جنم بھوم میں اختلاف ہے کوئی نیپال کی ترائی بتاتا ہے اور کوئی خاص مگدھ دیس (قدیم بہار) مگر یہ مسلم ہے کہ انکی تعلیم و تربیت بہار کی یونیورسٹی میں ہوئی اور راج گیر بہار میں تپشیا کی۔

اور قدیم دھرم کا نشان محو ہوا وہاں اُس پُرانی زبان سنسکرت کا نام بھی منکر رہ گیا!

## یونانی

بودھ مذہب کو پھیلے اور عروج پکڑے ہوئے اور پالی کا نام نکلے ہوئے ابھی پورے ڈھائی سو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یونانیوں نے دنیا میں سر اُٹھایا اور سکندر کی تلوار نے عالم میں خون کا مینھ برسایا۔ آریوں کا قدیم ملک (ایران) اسی کے ہاتھوں سے سر ہوا۔ وہاں کی معاشرت و تمدن میں فرق ڈالتا اور ژند کو روندتا پامال کرتا ہوا وہ یونانی سیلاب باغ ہند کی طرف بڑھا[1] اور سرحدی بند توڑتا ہوا پنجاب سے بھی آگے نکل آیا۔ اور گنگا جمنا کے کنارے آ لگا۔ سکندر نے یہاں اپنے اردو[2] کی چھاؤنی ڈال اپنے الفاظ کے لشکر کو بھی خیمہ زن کر دیا۔!

اس کے رخصت ہونے پر سلوکس[3] اس کا سپہ سالار ادھر کی ہوا کھانے نکلا چندرگپت سے مڈبھیڑ ہوئی اور آخر اپنی ایک بیٹی دان[4] کر کے لوٹ گیا۔ یہاں کی زبانوں اور یونان کے میل اور آمیزش بلکہ اس کے گھر کرنے کی یہ دلچسپ تاریخ ہے۔

## بدھ مت[5] اور پالی کا زوال اور ہندو دھرم و سنسکرت کا نیا جنم

بدھ مذہب کا منشا صرف اپنے مت کو پھیلانا تھا نہ کہ کسی خاص زبان کی ترویج و اشاعت۔ اُس نے اپنے دھرم کا سنگھ کسی ایک آلہ سے نہیں بلکہ اُن تمام آلوں سے

---

[1] ۳۲۷ سال قبل مسیح۔ [2] اردو معنی لشکر۔ [3] مشہور ہے کہ سلوکس نے چندرگپت کو بیٹی دی! [4] پالی گھر سے نکل کر برما و چین میں جا پہنچی [5] مت ڈوکٹران۔ اصول

پھونکا جو اسے بہ آسانی ملتے گئے اس لئے جن جن خطوں میں وہ (مذہب) پہنچا وہاں کی پراکرت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہو سکی۔ پالی مذہبی زبان بنکر سکنڈری لینگواج کے طور پر مستعمل رہی اور اس مذہب کے اخراج کے ساتھ اسے بھی دیس نکالا نصیب ہوا۔

سنسکرت کو عام نہ کرکے ہندو سلطنت اور ہندو دھرم کو جو نقصان پہنچا تھا بودھ سلطنت اور بدھ مت نے افسوس کہ اس سے سبق نہ لیا۔ پالی بھی عام نہ ہو سکی اور اسلئے زنجیر اتحاد بغیر کسی مضبوط کڑی کے بودی کی بودی رہی اور اس کا ٹوٹنا اور بکھرنا لازمی تھا یونانیوں کے سخت حملے بدھشٹ سلطنت کی بنیاد کھوکھلی کر چکے تھے کہ جین مت نے بدھ مذہب کی عظیم الشان عمارت کو بھی ہلا ڈالا۔ ویدمت (ہندوازم) کو پھر جاگنے کا موقع ملا۔ اس کی گری ہوئی دیوار اٹھائی گئی۔ ہندو دھرم میں پھر جان آئی اور سنسکرت نے بھی ساتھ ہی نیا جنم لیا۔

جو مختلف پراکرتیں یہاں بولی جا رہی اور عام ہو رہی تھیں وہ اس بیچ میں بہت زور پکڑ چکی اور بیرونی زبانوں کی مدد اور کمک پر بہت آگے بڑھ چکیں تھیں اس لئے اب جو سنسکرت میدان میں آئی تو اُسے شہ زور رقیبوں سے سامنا ہوا بکرماجیت اور راجہ بھوج کے سے حوصلہ مندوں نے اُسے اگلا سا عروج و اقبال دینے میں چند ہر بڑی کوششیں کیں، لیکن اس کے درخت اقبال کو گھن لگ چکا تھا اور آخر وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور ان مختلف پراکرتوں نے اس زمین میں جڑ پکڑ لی۔

## تاتاری و ترکی

یونانیوں کے بعد تاتاری اس باغ کو لوٹنے نکلے۔ پھر تورانی لپکے اور

---

ے ۱۲۶ سال قبل مسیح سے لیکر ۲۰۰ عیسوی تک ۱۲

آخر ترکی دوڑے چنگیز و تیمور کی ترکی بھی تمام ہوئی لیکن انکی زبانوں کا زور (جیسا کہ قاعدہ ہے) تمام[1] ہوا سنسکرت ہو یا یہاں کی اور بھاگا ایسے زبردست اثروں سے کیونکر بچتیں اور آخر فارسی، یونانی، اور ترکی بھی یہاں گھر کرکے رہیں اور یہاں کی زبانوں کا ایک جز و لاینفک ہو گئیں۔

ذرا آج بھی اگر کوئی ان زبانوں کی تشریح کرنے بیٹھے تو اس کے جسم میں وہ غیر زبانیں رگ اور پٹھوں کی طرح ابھری ہوئی نظر آئیں گی۔

## یہاں کی مختلف بھاکھا

نون ایرین زبانوں کا حال معلوم ہو چکا اور یہ بھی کھل چکا کہ یہاں سنسکرت کے آنے کے وقت تک ان کی زبانیں کیونکر صوبہ وار تقسیم در تقسیم ہو چکی تھیں اور گو سنسکرت ان کو مٹا نہ سکی مگر پھر بھی اس کے اثر سے وہ ہمیشہ گھری رہیں اور صدیوں کے انقلاب اور اس غیر زبان (سنسکرت) کے میل سے انکی اگلی سی صورتیں باقی نہ رہی تھیں بیرونی اثر بھی ان پر اکرتوں پر پڑتا رہا اس لئے گو اصلی مادہ فنا نہ ہوا مگر ان کی شکل و شمائل میں فرق آتا رہا[2]۔

اس وقت تک اصلی ہندیوں اور عام لوگوں کی جو پراکرتیں موجود تھیں ان میں یہ پانچ زبانیں ممتاز ہو رہی تھیں۔ اول مہاسٹری[3]۔ دوم سوراسنی[4]۔ سوم مگدھی[5]۔

---

[1] دیکھو تاریخ ہند از لتھبرج۔ [2] دیکھو کیلوگ کی گرامر۔ [3] مہاراسٹر جنوب سندھ اور موجودہ سورت سے ذرا نیچے ایک صوبہ تھا جہاں کی بھاکھا مہاراسٹری کہلائی اور پھر بگڑ کر مرہٹی ہو گئی [4] اصل سردسنی یا سُرسنی ہے سنسکرت میں سر یا سُر ڈا کے معنی محیط کے ہیں یعنی اس بان (بھاشا) کا احاطہ اتنا وسیع تھا کہ وہ سارے ہندو کو گھیرے ہوئے تھی [5] مگدھی۔ مگھدیس (قدیم بہار) بھاکھا جو کئی انقلابوں کے بعد پالی، بنی اور برج بھاشا میں جذب ہو گئی۔

چہارم پیشاچی[لہ]۔ اور پنجم اپبھرنسا[۲ہ]۔

ان پانچ میں سے سورا سنی علاقہ برج[۳ہ] (متھرا) کی بھاکھا تھی اور آگے چلکر اس نے وہ نام نکالا کہ اپنی ہمعصر باقی چار زبانوں پر حکومت کرتی اور آخر یہی یہاں کی لنگوا فرنیکا (راشٹر بھاشا) بن کر رہی۔ سنسکرت نے اُسے گویا گود لیا اور اس بچہ کو اپنی زبان چوسا کر پالا اور وہی اس سنسکرت کی نام لیوا قائم مقام اور خلف الصدق بنی!

اسی زبان کے آخر وہ شاعر ادیب ملک میں پیدا ہوئے جن کی دماغی صلاحیت عام طور پر تسلیم ہوئی اور دیگر بھاکھا نے اس زبان کی قوت کے آگے سر جھکایا اور ڈنڈوت کی۔

برج کا سبزہ زار و مرغزار اپنی خوبی آب و ہوا اور مردم خیزی کے باعث ...یراز سمجھا گیا ہے! در وسط ہند میں واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مرکز بنا رہا ہے جو مختلف ...میں اس دیار ہند میں آئیں اور علاقوں سے زیادہ اس علاقہ کو اُن سے واسطہ رہا۔ اس وجہ سے مختلف زبانوں کا اثر اور خطوں سے زیادہ اس علاقہ پر پڑا کیا اور اس سبب سے یہاں کی زبان میں اتنی وسعت و سیری آ گئی کہ اور طرف سے بے نیاز ہو کر

---

ہ۔ پرانے نقشہ ہند (۶۵۰ء) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ سورسینی مگدھ دیس (قدیم بہار) ...ہم سے شروع ہو کر شمال میں ملتان و لاہور تک پہنچا تھا۔ مغرب میں دریائے سندھ سے ملتا اور ...وب میں متھرا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے اجین تک پھیلا ہوا تھا۔

ہ۔ دیکھو لمبس کی گرامر انسائیکلو پیڈیا۔

ہ۔ برج اور سندھ دونوں ہم سوانا تھے اس قدرتی میل کا نتیجہ آگے معلوم ہو گا

ہ۔ راشٹر۔ ملک۔ راشٹر بھاشا۔ ملکی زبان۔

اپنی ہمعصر زبانوں پر حکومت دکھانے لگی۔

عرب جس وقت ادھر آئے اسوقت یہی سوراشٹی یا برج بھاشا یہاں راج رچ رہی اور تمام ملک میں جاری وساری اور عام طور پر بولی اور سمجھی جارہی تھی اور یہاں کی لینگو آفرنیکا یا اشٹر بھاشا بنی ہوئی گویا تمہاری اردو ہورہی تھی!

## عرب اور عربی

عرب اپنی آزادی وخودمختاری سے زیادہ اپنی زبان اور اپنے لٹریچر کیلئے مشہور ہیں۔ اسی زبان آوری کے بل پر انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہا۔ قدرت نے بھی ان کا ساتھ دیا اور جو کتاب انہیں عطا کی گئی اس کا ادب بھی دنیا میں عدیم النظیر تسلیم ہوا۔ عرب وادب دو متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں لازم وملزوم کی طرح دنیا کے ہر شعبہ اور گوشہ میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں۔ اُن کے صحرائی بادیہ نشینوں سے لیکر شہری اور محلوں کے مکینوں نے اُن کے علما وجہلا نے اُن کے مردوں اور عورتوں نے اُن کے بڈھوں اور بچوں نے اُن کے امیروں اور غریبوں نے اور اُن کے موالی[1] وموالی[2]

---

[1] موالی۔ دیکھو امیرالمومنین علی مرتضیٰ کے خطبات۔ دُرر وغرر اور آنحضرت کا مشہور دیوان علم وحکمت کیسا جذبات وشاعری اور زور کلام وزبان انسانی قدرت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ حضرت سیدہ کی رحلت پر ان کے فراق اور زمانہ کی شکایت میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎ کنّا کزوج حمامۃ فی ایکۃ متمتعین بصحۃ وشبابٖ دخل الزمان بنا ففرق بیننا + ان الزمان مفرق الاحباب یعنی ہم دونوں کبوتر کے جوڑے (اس تشبیہ سے اپنی معصومیت دکھائی ہے) کی طرح اپنے گھر میں رہتے اور صحت وشباب (یہ دونو زندگی کی بہترین نعمت ہیں) سے مالامال ہوئے مگر افسوس زمانہ (نیرنگ دنیا) بیچ میں آکودا اور واقعی وہ احباب میں بڑا فرق ڈالنے والا ہے

[2] موالی اس گھر کے غلاموں تک نے فصاحت وبلاغت اور زور زبان وکلام کے دریا بہادیئے ہیں جنگ کربلا میں امام سید الساجدین کے غلام حبشی کا پُرجوش رجز تاریخ کو نہیں بھولا دگار رہیگا ہے

(غلاموں) نے فطرت کے اس بڑے عطیہ یعنی جذبات و شاعری کی ہمیشہ پرستش کی اور سفر میں حضر میں، خوشی میں اور رنج میں، صلح کے میدان اور جنگ کے مصاف میں وہ انکی طبیعت ثانیہ بنی رہی ہے۔!

ایّامِ جاہلیت و وحشت میں گو وہ غیروں اور غیر زبانوں سے رَم کرتے اور صرف اپنی ہی زبان کو سراہتے رہے لیکن پیرو مقلد اسلام ہو کر وہ آزاد اور ایسے فراغ دل بنے کہ دوسروں کی زبانوں کے مزے کو بھی چکھا اور اپنے ایوانِ نعمت میں غیروں کو بھی شریک کر لیا۔ سلمان[1] فارسی وہ پہلا غیر ملکی ہے جو کہیں کا غلام ہو کر عرب پہنچکر اور سیّد عرب پاس حاضر ہو کر صرف آزاد ہی نہیں ہوا بلکہ آقائے اعراب بن گیا اور فارس کی شہزادی شاہزادہ[2] عرب کے محل میں کنیز ہو کر نہیں بلکہ ملکہ و مالکہ بنکر رہی!!

اور ان دونوں کے اعتبار و رسوخ سے عرب اور عربی نے دوسروں پر جو اثر ڈالا اور خود جس طرح متاثر ہوئے وہ ظاہر ہے۔

## تازی[3] و فارسی

مملکت فارس اور جنگِ نہاوند[4] جب عربوں کے بازؤں سے سر ہوئی اسوقت وہاں فارسی[5] حکومت کر رہی تھی۔ ایرانیوں کی سلطنت مٹی اور گو عرصہ تک فتح کی زبان

---

۱ پڑھو سلمان فارسی کے حالات ۲ حضرت شہربانو کا عقد امام حسینؑ سے ہوا۔ شہربانو کے ساتھ انکی متعدد سہیلیاں اور لونڈیاں بھی قید ہو کر مدینہ آئی تھیں، انمیں کا زیادہ حصہ اہلبیت نبوی کے ساتھ رہا اور اس سے عربی و فارسی کا اتحاد معلوم ہو جا سکتا ہے۔ ۳ تازی۔ عربی ۴ سنہ ۲۱ھ ۶۴۲ء ۵ فارسی جس طرح یہاں برج بھاشا سنسکرت کے چشمہ سے نہا دھو کر نکلی اور نکھری اور پھر آکر غسل ارتماسی پا کر اردو بنی۔ اسی طرح وہاں آتشکدہ ژند و پاژند سے فارسی شعلہ بنکر نکلی اور آخر عربی اصطباغ پا کر ٹھنڈی ہوئی۔

فاتحین ہی کے قبضہ میں رہی مگر ملکی زبان آخر تک مفتوح نہ ہو سکی۔ فارسیوں نے مذہب تک دیدیا مگر اپنی پیاری زبان کسی حال نہیں دی۔

خوش قسمتی سے ہارون[1] و مامون[2] دو قدردان بھی اس زبان کو مل گئے اور یہ انہیں کی عربی فیاضی کا اثر تھا کہ ملک اپنی زبان نہ بھولا اور آخر الپ ارسلان[3] کے عہد میں اور عمید الملوک کے سے نیشنلسٹ کی مدد سے فارسی پھر تازہ ہوئی لیکن چار سو سال کی میعاد جھیل کر اب جو نکلی اور آزاد ہوئی تو اور ہی جامہ[4] میں نظر آئی اور یہ وہی زبان تھی جو ترکوں اور مغلوں کی بدولت پھر اس دیار میں آئی۔ اور ہزاروں انقلاب کے بعد ملکہ فارس اور ہندی رانی کی سی بچھڑی ہوئی بہنوں میں پھر ملاپ شروع ہو گیا اور یوں ان دونوں کی وضعداری اور شرافت کا سارے عالم میں ڈنکا بجگیا۔

## پرانے تعلقات میں نیا پیوند

تغیرات اور انقلاب کے آسمان نے کئی سو سال کا چکر کھایا مگر ہند و ایران کے

---

[1] ہارون رشید عرصہ تک فارس میں رہا اور فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسکی خاتون زبیدہ نے اپنے بیٹے امین کے مقتول ہونے پر اپنا جذبۂ دل اسی فارسی میں نکالا۔ تذکرہ نویسوں نے اسکے یہ اشعار قلمبند کئے ہیں ~ اے جان جہان جہان ناخوش بے تو۔ بغداد پریشاں و مشوش بے تو۔ رفتی تو دمن بے تو بماندم فریاد۔ تو در خاکی و من در آتش بے تو۔ جب خود بادشاہ بیگم نے اس زبان کو یوں سراہا تو پھر باقی لوگوں نے فارسی کو کہاں تک اپنا نہ بنایا ہوگا۔

[2] مامون کی ماں ایرانی تھی اور اس کی عمر کا ایک اچھا حصہ فارس و خراسان میں گذرا۔ فارسی کی ہمیشہ اس نے قدر کی اور ابو العباس مروزی کے اس قصیدہ ~ ای رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرق دیں۔ گسترانیدہ بہ فضل وجود، در عالم یدیں۔ پر اسے ہزار دینار انعام دیا (دیکھو تذکرہ مجمع الفصحا از مرزا رضا قلی)

[3] ۴۴۲ھ میں سرکاری و دفتری زبان پھر فارسی ہوگئی [4] عربی نے فارسی پر جو اثر ڈالا اس کے بیان کیلئے علیحدہ فصل و باب کی ضرورت ہے اس میں شک نہیں کہ یہ اسی (فارسی) زبان کے استخوان تھے کہ ہم صدیوں تک شکنجہ میں کسے رہنے پر بھی سالم نظر آئے اور عربی کا ہما اسکو کسی طرح نہ کھا سکا؟ ظاہری صورت میں بیشک فرق ہوا مگر اسکی سیرت و مزاج میں قابل تمیز تبدیلی نہ ہو سکی!

تعلقات وکشش کی زمین بدستور قائم رہی۔ اس بیچ میں کبھی آفتاب مشرق، مغرب زمین پر چمکا اور کبھی ہلال مغرب افق مشرق پر نظر آیا۔ یوں ان دو ملکوں کا ستارا ملا کیا اور نوشیروانی دور تک یہی گردش[1] دکھائی دی۔ اور جبکہ رانی پشتاونی کے گھر کا چاند اور آیدر[2] کا آفتاب ایک ساسانی شہزادی کو اپنے برج و منزل میں لے آیا تو اتحاد زبان کا ستارہ اور چمکا اور فارسی و ہندی کا قرآن السعدین شروع ہو گیا۔

## عرب ہند میں

عرب، ایران سے فرصت پا کر اپنے ہمسوانا ملکوں کی طرف بڑھے۔ فتح نہاوند[3] سے ۱۸ برس بعد ہوائے باغ ہند سر میں سمائی قلعہ[4] ہرات یعنی دروازۂ ہند کھولا گیا۔ اور پھر کابل[5] پہنچکر وہ ملتان اتر آئے اور وہاں ڈیرے ڈالدیئے۔ شمال و مغرب کے پہاڑ اُدھر اس ہلچل سے گونج رہے تھے کہ ادھر انکی ایک جماعت دریائے سندھ عبور کر کے راجپوتانہ کے ریگستان میں گھس آئی۔ محمد علافی[6] ایک عرب نژاد بھی اسی زمانہ میں اپنے جیش سے علیحدہ ہو کر اپنے رفقا ہمیت ادھر آیا اور سندی بن کر اس نے راجہ داہر[7] سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے ان دو پرانی قوموں اور زبانوں (ہندی و عربی) کا ملاپ قدرتاً قائم ہو رہا تھا کہ محمد قاسم[8] کی کمک نے اس رشتہ کو اور مضبوط و محکم کر دیا۔!

---

[1] نوشیروان کی فوج ایک مرتبہ گجرات کی راجدھانی (ولبھی پور) تک بڑھ آئی تھی جنگ و صلح کے بعد تعلقات اور رشتے قائم ہو گئے [2] نوشیرواں کی پوتی راجہ ایدر کو بیاہی گئی۔ [3] ۲۱ھ ۶۴۲ع [4] ۳۸ھ ۶۵۸ع (خلافت علی مرتضیٰ) [5] ۴۱ھ ۶۶۱ع۔ [6] پڑھو محمد علافی کا حال [7] اخیر فرمانروائے سندھ جس نے قاسم کے ہاتھ سے شکست پائی۔ [8] ۹۱ھ ۷۱۱ع

# کچھ نئے تعلقات

راجہ داہر کی جنگ و شکست پرانی تاریخ ہند کا اخیر ورق اور عربی و ترکی و ایرانی خروج کا دیباچہ اور غیر اقوام سے نئے ارتباط و تعلق اور پائدار رشتہ کے پیدا و قائم ہو جانے کا دلچسپ عنوان ہے اِس ملک میں ابتک باہر کی بیٹیاں[۱] آئیں اور اپنی زبانیں ساتھ لائیں تھیں۔ مگر اب ہوا الٹی اور ہند کی بیٹیاں[۲] بھی باہر نکلیں اور اس آمیزش کی بدولت زبانوں کا سکّہ دونوں جگہ کرنسی ہونے اور چلنے لگا؟!

## عربی اور ہندی

قاسم تین برس تک سندھ میں رہا اور اپنی ملک انہی کی بدولت یہاں لگ گیا[۳]! اس کے اکثر ساتھیوں اور لشکریوں نے یہاں وصلت[۴] کی اور گھر بنا کر رہے اسکے

---

۱ سلوکس (سپہ سالار سکندر) کی بیٹی و درخت یا سانیان یہاں آئیں ۲ راجہ داہر کی رانی لادی محمد قاسم کے عقدِ نکاح میں آئی، حاکم دیبل کی بیٹیاں حجاج (امیرِ وقت) کے پاس بھیجی گئیں اور قلعہ راور (الور) کے سر ہونے پر علاوہ ۳۰ ہزار لشکری قیدیوں کے تین ہندی شہزادیاں اور راجہ داہر کی سگی بھانجی جیسیہ بھی عراق لائی گئیں اور ان جیسیہ کا نکاح عبداللہ ابن عباس سے ہوا اور پھر اسی واج کی دو اور شہزادیاں سوریا دیبی و پرمل دیبی (خلیفہ وقت کے محل میں داخل ہوئیں! دیکھو چچ نامہ و تاریخ میر معصوم ۳ قاسم کی واپسی اہل ہند پر بے حد شاق ہوئی انہوں نے غم و ماتم کیا اور آخر (بطور یادگار) اس کا بت بنا کر رکھا اور اسکی پوجا کرتے رہے (دیکھو چچ نامہ فتوح البلدان و تاریخ میر معصوم) ۴ اہل عرب اپنے ملک کے باہر اپنی عورتوں کو نہیں لیجا سکتے تھے اور نہ انہیں غیر ممالک میں زراعت وغیرہ کا اختیار تھا (دیکھو احکامات خلفاء) اسوجہ سے جہاں وہ جاتے مجبوراً وہاں کی عورتوں سے تعلق پیدا کرتے اور جو زمینیں انہیں صلہ جنگ میں ملتیں اس کا بندوبست وہاں کی رعایا ہی کے ساتھ کرتے یہ دونوں صورتیں وہ تھیں جن سے اہل ملک کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہتے تھے۔

جانے پر عرب کا قافلہ ٹوٹا اور برِ ّ سندھ بزارعکا نظر آنے لگا۔ عرب فتح فارس سے بہت سبق سیکھ چکے تھے۔ اور نو واردین کو غیر ملک میں جو دشواریاں عموماً پیش آیا کرتی ہیں اُس کا تجربہ رکھتے تھے۔ زبان کی دقتیں سب دقتوں پر ہمیشہ بالا ہوا کرتی ہیں وہ اُسے بھی خوب جھیل چکے۔

اور جس ملک کو انہوں نے ہمیشہ گونگا (عجم) کہا اس کے آلۂ زبان سے بھی آخر کام لے چکے تھے۔ یہاں کی مشکلیں ان کے لئے آسان تھیں۔ انہوں نے بلاتعصب و حقارت اپنی مفتوحہ زبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے بھی پہلو میں لا بٹھایا! خوش قسمتی تھی سندھ کی کہ اسے عرب جیسے فراخ دل و قدرداں ملے!

جنہوں نے محض اپنی زبان کا زور اور فاتحانہ قوت دکھانے اور صرف اپنے ہی ارگن (زبان) کو وقت ناوقت بجواتے رہنے کی ہوس میں کہیں کی شہنائی (زبان) کا کلیجہ نہ چھیدا[۱]۔

وہ خود صاحب زبان اور ادب ولٹریچر کے مالک تھے۔ اسلئے وہ دوسری زبانوں اور دوسرے لٹریچر کی قدر کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی قوم کو الکن کر دینا اسکی ہستی کو معدوم کر دینا ہے اور اس لئے ان میں کوئی ایسا بیدرد پیدا نہوا جس نے اپنی ہوم گورنمنٹ کو کسی ڈیسپیچ کے ذریعے سے اُس قوم کی زبان کی تحقیر و تذلیل کی ہو! انکی (عرب) زبان گو اس وقت علوم و فنون کی نہر لبن[۲] بنی ہوئی تھی

---

[۱] سویلیزیشن اور کلچر کے مدعی آج کیا کر رہے ہیں؟ بلجیم کی نرم و شیریں زبان (فرنچ) میں کھینچکر اب وہاں ایک کرخت و فولادی زبان جرمنی ٹھونسی گئی ہے۔

[۲]۔ عربوں کا قبضہ سندھ و ہند پر تین سو سال سے زیادہ رہا اور اسی مدت میں اپنے ادب و لٹریچر کو انہوں نے یہاں کے خزانوں سے بھی مالا مال کر دیا تھا۔

مگر انہوں نے محض اپنی آسانیوں کی خاطر دوسروں کی گردنیں اُدھر نہ جھکائیں وہ سمجھتے اور حق سمجھتے تھے کہ یہاں کی زمین کے شکم میں خود شہد و شیر کی نہریں موج مار رہی ہیں یہ ملک خود اپنے رُواۃ (ٹریڈیشن) اور اپنا سویلیزیشن رکھتا ہے اور اس کا ادب و لٹریچر دنیا میں ممتاز رہا ہے اسلئے اسکی قدر کی اور ایک پرانی قوم کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین نہ ہونے دیا!

دوسری طرف ہندی بھی غیر اقوام اور غیر زبانوں[1] کے صدیوں سے عادی ہو رہے تھے۔ عربی نئی ہو مگر غیر زبانوں کا چھینٹ اُن کی زبان کے خمیر میں آچکا تھا۔ اُن کے کان بیرونی لب و لہجہ اور حروف کے مختلف اصوات سے آشنا ہو چکے بلکہ اُن کے حلق و دنداں تک اُن آوازوں کھٹکوں اور شعبوں کے مخارج بن چکے تھے اسکے علاوہ خود ان کے ملک میں کئی کئی زبانیں اس وقت تک رائج تھیں اور وہ انہیں بے تکلف سمجھتے اور بولتے بھی تھے۔ ایسے ہفت زبانوں کے لئے ایک عربی کیا مشکل تھی؟ انہوں نے اس کا بھی خیر مقدم کیا اور اپنے گھر میں اُسے بھی جگہ دی!

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حکومت کسی پیچیدار مقراض سے ہماری زبان کاٹنا نہیں چاہتی وہ (حکومت) خود اسطرف بڑھ رہی ہے اور ہماری اسکی مشکل برابر کی ہے۔ انہیں (اہل ہند) اس کا بھی علم تھا کہ ہمارے فاتحین کی زبان پہلے ایک ہی سمندر تھی اور اب تو قلزم[2] بن رہی ہے اُس سے اپنے چشمہ کی سوتوں کو

---

[1] یونانی، ترکی اور فارسی

[2] یہی زمانہ ہے کہ یونانی علوم و فنون بھی عربی میں لائے جا رہے ہیں اور ہندوؤں کا فلسفہ اور ان کا علم جوتش عرب میں پڑھا جا رہا اور ترجمہ ہو رہا ہے۔ منکا اور صالح نے عہد ہارون میں اور میکہ و ابن دہان نے زمانہ مامون میں ہندی طب (ویدک) کے ترجمے کئے عرب میں اسوقت چرک و سسرت کے طبی تالیفات عام ہو چکے تھے۔

ملانا اور بڑ کرنا چاہئے۔ بے اطمینانیوں اور غلط فہمیوں کا راستہ کھلا نہ تھا۔ دونوں اپنے حدود کو سمجھ کر آگے بڑھے اور کوئی تصادم نہ ہوا۔ اور یوں عربی و ہندی کی آمیزش شروع ہو گئی!

یہ اسی بے تکلفی و یک جہتی کا نتیجہ تھا کہ خلفائے عرب کے عظیم الشان دربار تک یہاں کے علماء و فضلا، حکیموں اور پنڈتوں کی رسائی ہوئی اور اہل ہند کا اتنا اعتبار و رسوخ بڑھا کہ ہارون رشید نے لنکا مانک بابا کبیراج کو اپنے علاج کے لئے یہاں سے طلب کیا اور اسے عزت و افتخار کی کرسی بخشی[۱]!

یہی وہ زمانہ ہے کہ عرب سیاح اس ملک کی سیر کو آتے اور یہاں سے خوش خوش جاتے ہیں۔ مسعودی[۲] بھی ان ہی دنوں میں ادھر آیا اور اس ملک اور اہل ملک کی تعریف کرتا ہوا واپس گیا۔ ابن حوقل[۳] اس کے بعد یہاں کی سیر کو آتا اور ہندو مسلمانوں کے رشتۂ اتحاد کو خوشی مگر حیرت کے ساتھ دیکھتا اور کہتا ہے کہ ان دو قوموں (ہندو مسلمان) کے لباس، تمدن و معاشرت اور ان کی رفتار و گفتار میں فرق و امتیاز مشکل ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔!

سندھ اور دیگر اضلاع میں عربی اور ہندی بولی جاتی اور ملتان میں ملتانی و فارسی عام ہے!!

## برج بھاشا سندھی اور یہاں کی دوسری پراکرتیں!

جغرافیہ[۴] قدیم کی رو سے سندھ و برج کا ڈنڈا ملا ہوا تھا اور اس وجہ سے دیگر

---

[۱] دیکھو طبری [۲] در عہد سلطان مسعود ۳۰۲ھ دیکھو مروج الذہب۔ [۳] در زمانۂ المطیع باللہ عباسی [۴] دیکھو نقشۂ ہند ۶۲۹ھ و ۶۴۲ھ و آئین اکبری۔

صوبجات سے زیادہ اُن دونوں خطوں میں اختلاط و مراسم تھے۔ مرغزار برج کی کوئل یوں تو کہاں نہیں کوکی اور کس دل کو اُس نے اپنی طرف نہیں کھینچا۔ مگر سندھ اس کا پائیں باغ تھا۔ وہاں اس وقت سب سے زیادہ اثر پڑا۔ وہ بلبل ہند (بھاشا) جو باغ باغ اور چمن چمن کے پھول اپنی منقار میں لئے ہوئے تھی۔ جب اُڑ کر اُدھر پہنچی تو اپنے گلدستہ کے لئے عربی کے گل سرسبد بھی اُس نے چنے اور اپنے آشیانہ میں سجا کر رکھے۔

سندھی ہو یا یہاں کی اور پراکرتیں وہ خودرو تھیں، لائق باغبانوں نے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگایا اور نہ باہر کے چشموں نے انہیں سینچا۔ اس لئے وہ مرجھائیں اور بے برگ و بار رہیں۔ برخلاف اس کے برج بھاشا کاٹ چھانٹ کر درست کیگئی اور پھلدار میوہ دار بنی۔ شعراء اور ادیبوں نے اسکی آبیاری کی۔ وہ بڑھی گھنی ہوئی اور ہر طرف چھا گئی اور پراکرتوں کے ساتھ سندھی بھی اُس سے دبی اور آخر اُسی کے زیر سایہ رہنے لگی۔

---

۱؎ سنسکرت یونانی، ترکی اور قدیم فارسی۔

۲؎ سندھ و گجراتی وغیرہ آج تک رائج ہیں۔ مگر وہ پراکرتیں ہیں۔ زبان (لینگویج) کا درجہ نہیں رکھتیں جن اثروں سے شمال و مغرب بلکہ یورپ (گھڈیس) تک کی پراکرتیں میں انقلاب ہوگیا اور برج بھاشا بیچ میں کود کر آگے بڑھی اور ہر طرف چھائی اور پھر اس نے اردو کا لقب اختیار کیا اسی طرح جنوب ہند کی مختلف پراکرتیں کمزور اور ایک دوسرے میں جذب ہوکر اور بیرونی اثرات سے دبکر ایک نئی شکل میں ابھریں۔ اس نئی صورت کا نام دکھنی پڑا اس کی ساخت و ترکیب بھاشا اور اردو سے مختلف تھی اور اخیر میں وہ بھی اردو میں ضم ہوگئی۔ موجودہ سندھی و گجراتی اسی دکھنی (یا جنوبی اردو) کی کھرچن ہیں اس لئے انہیں کوئی مستقل زبان سمجھنا اور اردو سے مختلف جاننا نادانی ہے۔

# برج بھاشا اردو بننے کے لئے تیار ہوتی ہے!

اس ملک ہند (راشٹر بھاشا) کے قلمرو میں اب عربی[۱] کا وسیع میدان بھی آگیا تھا زبان اور الفاظ بھی موسمی تغیرات کے تابع ہوتے ہیں اور جس طرح فصل بدلتی اور اشجار پرانے رخت اتار کر نیا جوڑا پہنتے ہیں اسی طرح زبان اور لفظوں کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے فصل گذری، رُت بدلی اور زبان کے درختوں نے بھی نئی کونپلیں نکالیں۔ ہماری بھاشا کے چمن میں بھی ایسے بہت سے نوروز آئے کبھی اسکی کیاریوں میں اپنے ساگ[۲] پات کے ساتھ صرف سنسکرت ہی کے پھل پھول نظر آئے۔ کبھی یونانی و ترکی کے میوہ دانے لٹکے اور کبھی انگور شیراز کے رس ٹپکے۔ انکی بہار خزاں پر تھی کہ عربی خرمے زینتِ چمن ہونے لگے۔ یہ وہی تازہ میوہ تھا، صدیوں تک جس کا مزا زبانوں پر رہا اور اسکی چاشنی مدتوں قائم رہی۔

مبصرین جانتے ہیں کہ طفل زبان کی نشو ونما دنوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوا کرتی ہے۔ یہی حال اپنی اس بھاشا کا بھی سمجھو ایک وقت میں وہ معمولی پراکرت بنی ہوئی اپنی ہی گلی میں مست تھی۔ زمانہ کی ہوا نے وہ گدڑی اتاری اور سروشنی کا خلعت بخشا مگر مدتوں اسے باہر کی ہوا نہ مل سکی۔ صدیوں بعد وہ آزاد ہوئی۔ بڑی ہو کر

---

۱ عرب سندھ و نواح سندھ بلکہ تعلقات کی وجہ سے شمال و مغرب ہند و مغرب اور یورپ میں بھی تین سو برس سے زیادہ رہے اور اہل ہند ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں عراق و عرب میں آگئے دونوں کے سویلیزیشن اور زبانوں کا اثر ایک دوسرے پر کیونکر نہ پڑتا اور قانون فطرت سے کوئی قوم نکل کیونکر سکتی ہے۔ ۲ شروع میں معمولی پراکرت ہونے کی وجہ سے بھاشا کے چمن میں اس وقت ساگ پات کے سوا اور کیا تھا۔ یہ تو سنسکرت نے اسے گود لیکر اسکی قدر و قیمت بڑھائی۔

گھر سے نکلی۔ جگہ جگہ اپنی گٹھری کھولی اور شہروں شہروں سے سوغاتیں لائی۔ خود اپنی گرہ میں کیا کچھ نہ تھا۔ دساور کے مال نے رئیس بنایا اسی ریاست و امارت کے زمانہ میں عربی کے خزائن بھی ہاتھ لگے اور اب امیر کبیر بن بیٹھی[۱]

عربی نے بھاشا سے جو کچھ لیا وہ تو یہیں کی ملک[۲] ٹھہرا اور بھاشا نے عربی سے جو کچھ پایا وہ بھی اسی زمین کا حصہ ہوا۔ اسی صاف و جائز لین دین کی بدولت جس طرح سندھ خالص میں عربی و ہندی ایک ہو رہی تھی اسی طرح کچھ دنوں بعد مغربی و شمالی ہند میں بھی وہ دونوں شیر و شکر دکھائی دینے لگیں اور یہ اسی اختلاط و اشتراک کا نتیجہ تھا کہ عام لوگوں سے گذر کر عربی بھی ادیبوں اور کویوں[۳] کے شیریں دہنوں سے ٹپکنے اور آخر دیوتاؤں[۴] کے پاک منھ سے بھی جھڑنے لگی۔

اسی اختلاط کا نام کسی زبان کی ترقی و وسعت اور مدارج طے کر کے کسی خاص بام تک اُس کا پہنچنا ہے۔ ہماری بھاشا کی یہی وہ تدریجی ترقی و وسعت تھی جس نے پردیسیوں کو بھی پرچا کر اپنا کر لیا۔ اور انکی بے تکلف زبانوں سے آخر

---

[۱] بھاشا کی تعریف یہی ہے کہ اسمیں یہاں کے ہر خطہ اور قوم کے الفاظ و محاورات بہ کثرت موجود ہیں اور اسی وجہ سے اس ایک زبان کا جاننے والا اس وسیع براعظم میں ہر جگہ اپنا کام بآسانی نکال سکتا تھا۔ دوسری براکرتیں اس سے ہمیشہ دب جایا کرتیں اور آخر اسی کا بول بالا ہوتا اور یہی تمام راج رہتی۔ اسکی ملنساری نے جب باہر کے لفظوں (عربی، فارسی، ترکی) کو بھی جذب کیا اور اس کا اردو نام پڑا تو اس اردو کی بھی وہی حیثیت قرار پا گئی

[۲] ظاہر ہے کہ عرب یہاں مقیم ہو گئے تھے۔ یہاں کے الفاظ اپنے ملک میں کیونکر لیجاتے جو کچھ یہاں انہوں نے سیکھا وہ بھی یہیں نذر کیا۔ [۳] کوی سنسکرت و بھاشا میں شاعر کو کہتے ہیں

[۴] یہ دھو پرانے مذہبی منتر علمی کتبیں اور اخلاقی کہاوتیں

ایک نیا خطاب (اردو) پاکر اسے تسلیم کر لیا۔

اس ترقی یافتہ بھاشا (اردو) کی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے کئی صدی پیشتر یعنی اصل عربوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔!

اور اسی مبارک عہد سے ہماری بھاشا کا رجحان و میلان ایک خوشگوار انقلاب اور اس ایوولیوشن کی طرف نظر آتا ہے جس کی تکمیل پر ایک دو نہیں چند در چند اور مختلف قوموں کے بکھرے ہوئے تار ایک رشتہ میں جڑ کر مضبوط و مستحکم ہو گئے

## نئے سیّاح اور بھاشا کی فتح

وسط اور مغربی ہند کی پرانی اور نئی[۱] قومیں گردنوں میں ہاتھ ڈالے ابھی سکھ نیند سو رہے ہیں اور طفل بھاشا بھی اپنے گہوارہ میں جھول رہا اور اپنی دونوں ماؤں اور دادیوں کی میٹھی لوریاں سن رہا تھا کہ بیچین دنیا کے ایک حصہ میں ہیجان شروع ہوا۔

زمانہ کئی صدی آگے بڑھ آیا۔ عربی و ایرانی علم ٹھنڈے ہوئے اب ترکوں کا نجم چمکا۔ آل سامان[۲] کی بے سروسامانی نے اس گھر کے ایک غلام الپتگین کی کمر کسوائی۔ غزنی و کابل پر ہاتھ مار کے اس نے بیڑا کھولا۔ سبکتگین[۳] اس کا جانشین گھر کا بندوبست کر کے باہر کی ہوا کھانے نکلا۔ باغ ہند بغل میں تھا، پہلے ادھر متوجہ ہوا۔[۴]

---

۱عرب و ہندی ۲ سامان ایک پارسی امیر تھا مسلمان ہوا اور اس کی اولاد عباسیوں کے وقت بڑھی اور رفتہ رفتہ مشرقی ایران پر قابض ہو گئی ۳ سبکتگین غلام الپتگین۔ مگر کہتے ہیں کہ وہ شاہ یزدگرد کی نسل سے تھا۔ ۴ ۳۶۷ھ ہجری۔

راجہ جے پال سے دوبدو ہوئی۔ جنگ صلح و پیمان سے بدلی اس پیمان کی شکست پر سبکتگین جھلایا ہوا پھر لوٹا اور اب کے اس باغ کا دروازہ زبردستی کھول لاہور بلکہ اٹک تک دریا کی طرح بڑھتا چلا آیا۔

محمود اس کا فرزند یہاں کی بہار پر غش تھا باپ کی جگہ لیتے ہی اِدھر کی ہوس بڑھی اور وہ سترہ[۱] دفعہ پوری ہوئی۔

اس کی یہ گلگشت، کچھ نئی بہاریں ساتھ لائیں اور ہند و ترک کے تعلقات کا نوروز پھر شروع ہو گیا۔

اتحاد زبان اور اتحاد خیالات کا جو بیج وہ بو گیا وہ آخر پھوٹا پھبکا درخت بنا اور بڑھکر رفتہ رفتہ اتنا گھنا اور عظیم الشان ہو گیا کہ کوئی باد مخالف آٹھ سو برس تک اُسے ہلا نہ سکی۔!

یہ اسی کی سیاست و مروانگی تھی کہ یہاں سے (راجہ) جیپال مہمان بنکر غزنی گیا اور یہ اسی کی حوصلہ مندی تھی کہ بھٹنڈہ لے کر پھر یہیں کے ایک راجہ (سکھ پال) کو حوالہ کر گیا۔ یہ اسی کی فراست تھی کہ ہندی سپاہی اُس نے اپنی فوج میں بھرتی کئے اور ہند و خراسان کی راہ کھول کر دونوں کو ایک کر دیا یہ اسی کی سچی دوستی اور مروت تھی کہ جب راجہ کنور رائے نے اپنا ملک قنوج حوالہ کر کے اس سے بھائی چارا قائم کیا تو پھر محمود اسکی امداد پر تل گیا اور کالنجر والوں نے جب قنوج کو روندنا چاہا تو وہ (محمود) اپنے دوست کی کمک پر غزنی سے آندھی کی طرح اٹھا اور کالنجر والوں پر گرجا اور برسا!!

---

[۱] محمود ۳۹۰ھ / ۱۰۰۰ء میں ادھر آیا اور اسکے سترہ حملے مشہور ہیں۔ ۱۲-

سومنات کا افسانہ سنتے سنتے کان کر ہو گئے اور انگریزی درسی تاریخوں نے ہمارے بچوں کو محمود سے عداوت و نفرت رکھنے کے سوا کچھ نہیں سکھایا!

اس لیٹرے کے سلوک و رواداری کا چرچا بھی کہیں سنا ہو تو بولو اور کبھی یہ بھی بتایا گیا ہو تو کہدو کہ اُسی سومنات کے لوٹنے پر اس کا سیر حاصل علاقہ وہ (محمود) کس فیاضی سے یہیں کے ایک پنڈت واشلیم کو تفویض کر گیا۔

شاہنامہ فردوسی کی داستان بھی سنی اور حسن میمندی کو چھوڑ کر ہجو محمود زبان زد خاص و عام ہو گئی۔ مگر بہت کم آنکھوں نے محاصرۂ گوالیار اور راجہ نندارائے کے نتیجہ خیز واقعہ[1] کو دیکھا۔ جب یہ (محمود) گوالیار[2] پر چڑھا اور قلعہ پر سخت محاصرہ ہوا تو وہاں کے (راجہ نندارائے) نے صلح کی درخواست کی اور ہزار لالچ دیئے مگر محمود اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آخر راجہ نے اپنی بھاشا میں ایک قصیدہ نظم کر کے اُسے بھیجا۔ محمود پر اس نظم کا وہ اثر ہوا کہ اُس نے قلعہ ہی سے ہاتھ نہ اٹھایا بلکہ پندرہ اور اپنے مفتوحہ قلعے اس راجہ کو بخش کر واپس چلا گیا!!

ہمارے مخدوم بابو نریندر ناتھ (ایم اے) اپنی کتاب ترقی علوم و فنون در زمان مسلمان بادشاہانِ ہند میں اس نتیجہ خیز واقعہ کو نقل کر کے کیا خوب کہتے ہیں کہ دنیا میں آجتک کسی زبان و لٹریچر کی ایسی فتح و فیروزی اور کسی فاتح کا ایسا عمدہ مذاق نہ کانوں نے سنا اور نہ آنکھوں نے دیکھا[3]!

یہی وہ بھاشا تھی جس نے یوں ملکِ دل پہ چھینے اور یہی وہ مشترکہ زبان تھی جو

---

[1] دیکھو طبقات اکبری [2] سنہ ۱۰۲۳ء [3] دیکھو پرموشن آف لرننگ آف ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول بائی [illegible] مطبوعہ لونگمنس گرین لندن سنہ ۱۹۱۶ء

محمود کے وقت تک اتنی سیر ہو گئی کہ ایک ترک پر یوں قبضہ کر بیٹھی!!

یہ محمود ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ مسعود (اسکے فرزند) نے اور لوازماتِ سلطانی کے ساتھ ہند کے تعلقات کو بھی قائم رکھا اور یہی وال کو نفی ڈلنس کو ہمیشہ بڑھاتا رہا اس کا ہندی رسالہ اور اس کا افسر سپاہ سونیڈ رائے سلطان کا معتمد حملہ کرمان وہرات میں پیش پیش تھا۔ اس تعلق واعتماد کو یہیں پر ختم نہ سمجھو۔

صرف بیس پچیس سال کی آمد ورفت اور شناسائی میں ایک شریف قوم دوسری شریف قوم پر وہ اعتماد وبھروسہ کرتی ہے جیسے آج ہندوستان ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگ رہا ہے اور جو اُسے آج سے ہزار سال قبل بے مانگے حاصل تھا!

حضور وائسرائے جے پور تشریف لے گئے تھے وہاں انہیں اکبر اور راجپوتوں کے پرانے تعلقات بے اختیار یاد آئے اور وہ راجہ مان سنگھ کی سروری وسرداری کا تا دیر ذکر فرماتے رہے۔[۱]

اسپر ہمارا بنگالی (اخبار) نوٹ لکھ کر موجودہ حکومت کو اکبری اعتبار وبھروسہ کا سبق پڑھاتا ہے۔ مگر شاید اُسے یہ معلوم نہیں کہ اکبر اس کا موجد نہیں بلکہ محمود کا فرزند سُلطان مسعود اس کا بانی ہے!

تاریخ دونوں پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ محمود پنجاب اور اطرافِ پنجاب کو اپنی سلطنت میں داخل کر کے اپنے امور میں الجھ گیا اور پھر ادھر کی خبر نہ لے سکا۔ سلطان مسعود نے پھر ہند کا خیال کیا۔ احمد نیال یہاں کی گورنری وسپہ سالاری پر بھیجا گیا لیکن سُلطان کو اس کے کاموں سے تشفی نہیں ہوئی اور نظم ونسق ہندوستان کے لئے

---

[۱] - پڑھو حضور وائسرائے کی جے پور والی اسپیچ۔ ۱۲۔

کسی معتمد کے بھیجنے کی فکر ہوئی رائے و مشورہ کے لئے کونسل بیٹھی اور سب نے بالاتفاق ایک ہندو سردار تلک[1] کو (جو وہاں حاضر دربار تھا) پیش کیا سلطان نے یہ رائے پسند کی اور سردار تلک سپہ سالار و گورنر کل ممالک محروسہ ہندوستان مقرر ہو کر بڑے خدم و حشم کے ساتھ ادھر بھیجا گیا!!

یہی وہ اتحاد و اتفاق تھا جس نے دو مختلف قوموں کو متفق کر کے اُن کی زبانوں کو بھی آخر ایک کر دیا! بیرونی[2] اسی وقت میں اپنے اصلی وطن ہند کی زیارت سے مشرف ہوا اور یہاں سے علوم اور زبانوں کے وہ ذخائر لے گیا کہ ایران و ترکستان میں مدتوں اُن کا چرچا رہا[3] اور ہندی و فارسی پھر اس طرح بھٹنا اور مخلوط ہونا شروع ہو گئی۔

## فارسی کا یہاں گھر کرنا اور ہندی سے پہناپا!

ہندی اختلاط و ارتباط کا حال بھی تم پڑھ چکے اور مسعودی و بیرونی فارسی

---

[1] تلک مذہباً و قوماً ہندو تھا۔ محمود کے پیدا کردہ تعلقات نے اُسے غزنی پہنچایا وہاں اس نے قاضی ابوالحسن کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا اور پھر دربار مسعود میں پہنچکر عزت و افتخار کی کرسی حاصل کی۔

[2] بیرونی (ابوریحان) سندھ کے ایک شہر بیرون میں تقریباً ۳۶۰ھ (۹۷۰ء) میں پیدا ہوا تحصیل علوم کا شوق اسے عرب ایران لے گیا۔ شاہ فارس شمس المعالی قابوس نے اسکی عزت کی اور اپنا وزیر بنانا چاہا۔ مگر اس تشنۂ علم کی اس عہدہ سے کیا سیری ہوتی۔ وزارت سے انکار کر کے محمود پاس چلا آیا اور اپنے علمی تحقیقات و تصانیف میں معروف رہا اور اپنے اصلی وطن ہند کی سیر و سیاحت پر کمر باندھی ادھر آیا اور عرصہ تک یہاں رہکر یہاں کے علوم (مذہب فلسفہ اور نجوم و طب وغیرہ) حاصل کر کے پھر ترکستان ایران چلا گیا اور وہاں اپنے معلومات سے فائدہ پہنچاتا رہا۔ بیرونی پرانوں کے فلسفہ مذہب کا عاشق اور بھگوت گیتا کا بیحد ادب کرتا ہے۔ [3] دیکھو کتاب الہند از بیرونی۔ ۱۲

و ہندی ملاپ کی تاریخ بتا چکے محمود و مسعود نے اس یکجہتی کو بڑھایا لیکن جب تک غوری جم نہ لئے اور اوچہ[1] کی راج کماری شہاب الدین کے محل میں داخل نہ ہولی ہندو مسلم اتحاد اور ہندی فارسی اختلاط ترقی نہ کر سکا اور جب تک ترکی غلام یہاں کی خاک پاک کا قشقہ کھینچ اس دیر میں آسن جما کر بیٹھ نہ گئے آقائے ہند نہ بن سکے اور فارسی ہندی کا ریختہ پختہ نہ ہو سکا۔ یہ غلام شاہوں کا دل و دماغ لائے تھے اس زمین کے ساتھ انہوں نے شاہانہ سلوک کئے اور حسن ادب و انشاء نے عجم کو گویا اور انہیں (ترک) دنیا میں رسا کیا اُسے زینت تاج و تخت سمجھتے اور خلوت و دربار میں ہمیشہ بار دیتے رہے۔

ان ہی کے وقت میں دکھن و بنگال و فارسی کے زیر نگیں ہوا اور دلی زبانوں کا مرکز اور علوم کا گھر بنی ہوئی غزنی و بغداد پر چشمک زن ہو رہی تھی عربی و ایرانی فضلا و امراء کے ساتھ شعراء و ادبا کی آوازیں بھی دارالامارت کے ہر گلی کوچہ میں گونج رہی تھیں نئے اور پرانے خیالات مصافحہ کر رہے اور مہمان و میزبان کی زبانیں گلے مل رہی تھیں کہ سلطان بلبن[2] کا مبارک وقت آپہنچا اور میر خسرو کا طوطی زبان بولنے اور چہکنے لگا۔ رنگ محل کا تماشا ان سے بہتر کون تھا اپنی خالق باری کے پردے میں وقت کا ساز چھیڑ کر صحبت گرما گئے اور خالق باری سرجن ہار ٭ واحد ایک بڑا کرتار سے بسم اللہ کر کے دونوں زبانوں کے ساز بلز ہی کا

---

[1] دیکھو فتح اوچہ کے حالات [2] ۶۶۴ھ ۱۲۶۶ء یہ بلبن ہی کا زمانہ تھا کہ شہزادگان و امرائے ترک و ایران جوق جوق یہاں آئے اور دلی کا گلی کوچہ انکے ناموں سے آباد ہو گیا۔ فضلا و شعراء ایران سے دربار سلطان ہمیشہ بھرا رہتا بادشاہ خود ادیب شاعر تھا اور اسکے بڑے بیٹے سلطان محمدؒ کے علم و فضل اور شاعری سے عشق کی حکایتیں آج تک مشہور ہیں۔

نہیں بلکہ وہ مذہبی قوموں کے خیالات وجذبات کو بھی بتا اور سمجھا گئے! اور فارسی کے یہاں گھر کرنے اور ہندی سے بہناپا ہو جانے کی ایک نادر و مزیدار تاریخ لکھکر چھوڑ گئے!

خسرو۔ پائے تخت کے شاعر شہزادوں کے استاد اور شاہوں کے رفیق و ہمدم تھے انکی زبان گویا سلطنت کی زبان تھی۔ یہ خالق باری حاکم و محکوم دونوں کے دل کا آئینہ بنی اور اسکے لفظ لفظ سے اس وقت کی حکومت اور رعایا کے اصلی حالات کا مرقع پیش نظر ہو گیا!

## فارسی ہندی عشق!

جس ضرورت نے خالق باری کو پیدا کیا۔ وہ ضرورت روز بروز بڑھتی اور پوری ہوتی رہی۔ شاہی اثر بھی اسے مدد دے رہا اور ہندو مسلم اتحاد بڑھ رہا تھا کہ خلجیوں[۱] کا دربار چمکا اور اب ایرانی علماء کے ساتھ ہندی فضلا بھی زینت مجلس ہونے لگے۔ کتھا کس ایک فاضل و متبحر پنڈت و منجم اسی دور کا آفتاب علم و دانش مانا گیا اور مغربی و مشرقی علوم و زبان کی شعاعیں لیں اور اس زمین کو منور کرنے لگیں علاؤالدین اس آسمان کا وہ شاہ خاور ہے جس کی بدولت اتحاد کی روشنی اور پھیلی، گجرات کی زہرہ جمال رانی کملادیوی[۲] نے اس کی منزل کو منور کیا اور بادشاہ اس پر دین و دولت نثار کر بیٹھا۔ قلعۂ سلطانی راج گڑھ بنا اور محل کے اندر اور باہر

---

[۱] ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء

[۲] کملادیوی راجہ کرن رائے کی رانی۔ دیکھو حالات فتح گجرات در ۷۰۶ھ ۱۳۰۶ء

فارسی، ہندی، جھنڈا ساتھ اڑنے اور لہرانے لگا۔!

اس نشان اخلاص کو سلطنت کے دو شریکوں خضر خاں[1] و دیول دیوی نے اور بلند کر دیا۔ ان کے آپس کی مہر و الفت نے قصۂ نل دمن کو افسانہ بنا دیا۔ شعرا نے اسکی یاد تازہ رکھی اور فارسی ہندی عشق کا چرچا دونوں زبانوں پر رہا!!

## فارسی ہندی گورنمنٹ

یہی وہ رکھی بندھن تھا جس نے دو مختلف قوموں کو ایک رشتہ میں باندھکر حاکم و محکوم کی مغائرت اور بھڑک دور کر دی اور فارسی کی سلطنت میں ہندی بھی شریک ہوگئی! اس دلی اتحاد نے آخر وہ زور پکڑا کہ قومی اختلاف مٹا اور قطب الدین (مبارک شاہ) نے ایک ہندو نژاد خادم کو خسرو کا خطاب دیکر اپنے تخت پر جگہ دیدی! اسکی نیابت وزارت میں ہندیوں نے اپنے ملکی کاموں کا بار اٹھایا اور اسکی بادشاہت میں تو فارسی ہندی پہلو بہ پہلو نظر آنے لگی۔!!

یہ تھا آج سے نو سو برس قبل کا اتحاد اور یہ تھی وہ ہندوستانی سلف گورنمنٹ جسے ہماری تاریخ داں جماعت اب تک مزے لے لیکر یاد کر رہی ہے!

---

[1] خضر خاں (پسر علاؤ الدین) و دیول دیوی (دختر کملا دیوی) کے عشق و محبت کے قصے زمانہ میں یادگار رہیں گے۔ ہندی و فارسی شعرا نے اسپر نظمیں لکھیں۔ اور میر خسرو نے تو اپنی ایک مثنوی ہی ان کے نام پر معنون کی دیول دیوی واقعی ہر دو فا کی دیوی تھی جو خضر خاں کے ساتھ قید خانہ میں شہید ہو کر ہندی کی کیرکٹر کا نام زندہ کر گئی اسی واقعہ کی طرف خسرو نے اشارہ کیا ہے

بجائے آب ازاں گل خوں چکیدند  نگہ کن تا گلابش چوں کشیدند

# کچھ تازہ تعلقات

یہ استحکام روز بروز ترقی کر رہا اور ادب و انشا کا مذاق بھی ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا کہ شاہان تغلق اپنا علم لئے نکلے یہ سیف و قلم دونوں کے بادشاہ تھے ان کو مدتوں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا لیکن ادب و لٹریچر کا چسکا وہ بدبلا ہے کہ تلوار کی جھنکار میں بھی اسی کی خوش آئند آواز کانوں میں آیا کرتی ہے! محمد تغلق کی محفل بھی یوں ہی جمی اور جب اس نے ذرا کمر سیدھی کی شعر و شاعری کی کلفت دور کرنے سامنے آ بیٹھی۔ یہ خود شاعر ادیب اور فضلائے روزگار میں سے تھا۔ اس کا دربار شعرا سے گھرا رہتا اور عربی و فارسی ادیبوں کے ساتھ کوئی[1] بھی دامن دولت سے لپٹے رہتے اور انہیں مالا مال کرتا رہتا[2] یہاں کی بھاکھا کے علم اور اس کیساتھ شاہی دلچسپی و محبت کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب وہ ایک مہم کے عزم پر فرخ آباد کے ایک قصبہ کھور میں اترا اور وہاں اسے آرام ملا تو خوش ہو کر اس قصبہ کو سرگ[3] دواری (دروازۂ جنت) کا لقب بخشا اور اس طرح رعایا کا دل شاد کر کے اتحاد زبان کا سبق دیتا ہے!

سلطان فیروز ادب و شاعری کو ترقی دینے اور غیر زبانوں میں رسم راہ پیدا کر دینے میں ہارون و مامون وقت تھا یہ بھی محمود (تغلق) کیطرح فاضل[4] اور

---

[1] دیکھو مسالک الابصار فی ممالک الامصار ابو العباس [2] دیکھو سفرنامہ ابن بطوطہ محمد تغلق نے شمس الدین اندکانی کو اس کے ایک فارسی قصیدہ کے صلہ میں، ۲ لاکھ دینار عطا کیا [3] سرگ بہشت اور دواری دروازہ [4] فیروز نے اپنا تزک (آپ بیتی) خود لکھا ضیاء الدین برنی و سراج عفیف کے سے مورخین اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔

دلدادۂ علوم و فنون تھا۔ نگر کوٹ سے سنسکرت و ہندی (بھاشا) کی ہزارہا کتابیں دلی ساتھ لایا انہیں سُنا اور پنڈتوں اور علماء کو جمع کر کے ان میں سے اکثروں کے ترجمے کا حکم دیا۔ علماء کو یہاں کی زبان بتائی اور پنڈتوں کو فارسی سکھائی اور یوں اُن دونوں میں ربط ڈالا! اور یہ اسی مبارک عہد کا نیک شگون تھا کہ عام لوگوں سے گذر کر سب علمائے ہند کا لب و لہجہ بھی بدلا اور انکی زبان میں وہ فرق ہو چلا جس کا نتیجہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک نئی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ نئی صورت آپکی اس اردو کا وہ پتلا تھی جو صدیوں کی مشق و کاریگری کے بعد آخر ایک دن دنیا کے سامنے کھڑا ہو گیا!

## فارسی تعلیم اور ہندی عروج

ان علمی چرچوں اور قوموں اور زبانوں کے ارتباط و اختلاط کو ایک صدی گزر چکی اور دماغوں میں یکسوئی پیدا ہو چلی تھی کہ لودھیوں کا دربار

---

له سلوتر (سالی ہوترا) کی سنسکرت تصنیف اسکے حکم سے (فارسی میں) ترجمہ ہو کر قرۃ الملک بنی۔ علم حیوانات پر یہی وہ نایاب کتاب ہے جسے بحکم شاہجہاں عبداللہ خاں فیروز جنگ نے اضافوں اور حاشیوں کے ساتھ دوبارہ ترتیب دیا۔ دلائل فیروز شاہی سنسکرت سے ترجمہ تاریخ فیروزشاہی از برنی اور عین الملکی بھی کتابیں اسی کے حکم سے تصنیف ہوئیں۔! **نوٹ**:۔ مورخین کہتے ہیں کہ محمد تغلق کے دربار میں بکثرت شعرائے فارسی گو کے علاوہ ہندی شعرا بھی بکثرت تھے۔ سلطان فیروز کے عہد میں اور ترقی ہوئی یہ فیروز ہی تھا جس نے مندروں یادگاروں کی توقیر کی اسوکھ کے میناروں اور ستونوں کو جو ضلع خضرآباد میرٹھ میں پڑے تھے کس میرسی کی حالت میں پڑے تھے بغیر ریل کی کمک اور موجودہ انجنیری کی مدد کے صحیح و سالم اپنے دار السلطنت تک لے آیا اور یوں ہمارا دل شاد کیا! آتا سی گھڑیال (نام پر غور کرو) بھی اسی کی ایجاد ہے جسے موجودہ زبان میں گھنٹہ گھر کہتے ہیں اور تاریخ سے نابلدی کی بدولت اسے ہم یورپین ایجاد سمجھتے ہیں (دیکھو خلاصۃ التواریخ از سبحان رائے کھتری۔

چمکا۔ یہ محفل اگلی صحبتوں کی یادگار اور پرانی وضع وطرح میں گذشتہ مجلس سے زیادہ پختہ و دیرپا تھی۔ بہلول کے بعد سکندر نے اس انجمن کو رونق دی یہ واقعی نصیبے کا بھی سکندر تھا۔ اور اس کا زمانہ دلوں کی فتح اور معاشرت قومی کی شکست کے لئے صفحۂ روزگار پر ہمیشہ نمایاں رہے گا وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح ادب و انشاء کا عاشق اور شاعری پر فریفتہ تھا۔ گلرخ[1] تخلص کرتا اور قصائد و غزلیات کا شیفتہ رہتا اپنے ادب کے ساتھ یہاں کے لٹریچر کی اشاعت میں وہ محمد فیروز (تغلق) سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ارگرہا بیدک کی سی طبی تصنیف کو اسی نے فارسی کا خلعت بخش کر طب سکندری خطاب دیا! علم کے شوق کی انتہا یہ تھی کہ سیف وقلم کو اس نے ایک ہاتھ میں پکڑا دیا۔ فرمان ہوا کہ ہمارے فوجی ملازم ناخواندہ نہ رہنے پائیں اس حکم نے تعلیم کو عام اور جاہلوں کو خواندہ بنا کر ملک بھر میں شائستگی پھیلادی!

اس سکندر کا یہی ایک آب حیوان نہ تھا بلکہ ملک و قوم کی سر سبزی کیلئے اور بھی بہت سے چشمے اس نے جاری کئے انتظام ملکی کے لئے کالے گورے کا امتیاز اسی نے اٹھایا اور صرف علم کو معیار قرار دیکر حاکم ومحکوم کو ایک ہی صف میں اسی نے کھڑا کر دیا اس حکم پر ملک بھر میں چراغاں ہوئے اور تحصیل علم کے لئے خلقت ٹوٹی۔ اہل ہند بشوق آگے بڑھے اور سلطنت کی زبان سیکھ کر دولت کے شیر بنے اور بقول مسٹر بلوک مین[2] بہت جلد وہ اپنے استادوں پر سبقت لے گئے

---

[1] سلطان کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے ؎

گلرخ چہ کند جوہر دندان ترا وصف ہمچو در سیراب سخن در دہنش

[2] دیکھو کلکتہ ریویو۔ مسلم تاریخ کا ایک باب از پروفیسر بلوک مین۔

بہت کم مدت میں نئے خیالات اور نئے مذاق عام ہوگئے اور کوئی شاعر بنکر سعدی و حافظ کا گھر گھر درس وسبق دینے لگے۔ پنڈت ڈونگر مل[1] اسی سکندری عہد کے وہ ادیب ہیں جن کی شاعری اور زباندانی نے مسلمانوں کے کان بھی کھڑے کر دیئے اور وہ اساتذہ میں شمار کئے گئے۔

## اردو

جبکہ حاکم و محکوم کا امتیاز یوں اُٹھ رہا۔ اور تعلیم اس طرح عام ہو رہی ہو تو پھر سلطنت و رعایا کی زبان بھی کبتک ایک نہ ہو جاتی ضرور ہوتی اور فارسی ہی ملکی زبان قرار پاتی۔ لیکن یہ سلاطین اب ہندی ہو چکے اور یہیں کی خاک کو اکسیر و کیمیا اور یہیں کے پتھروں کو اپنا پارس سمجھ رہے تھے وہ علاوہ اور ملکی اثرات سے متاثر ہونے کے یہاں کی ریت و رسم تک اختیار[2] کر چکے تھے۔ محفل و مجلس میں گوٹا ہار کے ساتھ پان کے بیڑے تک بے تکلف آتے اور صرف مُنہ چھوانے نہیں بلکہ مزا لینے اور مزہ دینے کی خاطر چنگیروں پر چنگیر پیش کش ہوتے رہتے۔ اور تو اور بائین تقاہت سلطان سکندر تک اس اثر سے بچ نہ سکا اور ملکی رنگ اس پر ایسا چڑھا کہ قومی شعار کا لباس اتار پھینکا۔ پستینی[3] داڑھی رسم ہند کے آگے نذر کر بیٹھا اور محتسب وقت

---

[1] پنڈت کا یہ ایک شعر اکثر تاریخوں میں نظر آتا ہے۔

دلِ خوں نشدے چشم تو خنجر نہ شدے گر ــــ رہ گم نہ شدے زلف تو ابتر نشدے گر

[2] اختیار کرنا ــــ [3] دیکھو تاریخ فرشتہ وغیرہ۔۱۲

مولوی عبدالوہاب[1] کے طعنوں سے بھی ذرا نہ ڈرا۔

جن سلاطین کے یہ بے تکلفانہ رنگ ہوں اور جنہوں نے ہند کو گھر بنایا اور اسکی پیداوار پر اپنی ہستی کا مدار سمجھا ہو اُن سے کیونکر امید کیجا سکتی تھی کہ اس زمین کی بہترین پیداوار (زبان) کا روندنا دیکھ سکیں گے انہوں نے اسے بھی نعمت سمجھا اور اس نئی تعلیم کے چشمہ سے اُسے تازہ اور ہرا رکھنا چاہا۔ یہاں کے کویئوں کو اپنے شعرا کی طرح مانا اور انہیں بھی اپنا جانا اور اس طرح بھاشا پامالی سے بچکر پھولنے پھلنے لگی۔

دوسری طرف رعایا تھی جس کے لئے فارسی نئی اور غیر نہ تھی وہ جانتی تھی کہ ہماری مذہبی زبان (سنسکرت) اور سلطنت کی زبان کا ایک ہی خاندان ہے اور مرحوم سنسکرت کی اب یہی ایک یادگار باقی ہے وہ فارسی کی حکومت اور سیادت و وسعت[2] سے بھی واقف اور اپنی بھاشا کے مزاج و ماہیت[3] سے بھی آگاہ تھی۔

---

[1] دیکھو داؤدی مکالمہ عبدالوہاب و سلطان سکندر۔ [2] فارسی کی حکومت تو ظاہر ہے کہ اسوقت ماوراءالنہر سے لیکر ترکستان تک اور ہیرات سے لیکر بنگالہ اور ہمالہ سے دکھن تک اسی کے زیر نگیں تھا۔ سیادت کا یہ حال کہ عربی اخلاق و مذہب کے ساتھ ہندوؤں کا پرانا اخلاق و فلسفہ اور انکے علوم بھی اس زبان میں آچکے تھے اور وسعت کی یہ کیفیت کہ نظم و نثر میں دنیا کی تاریخ و حکایات کا ذخیرہ موجود تھا ایک شاہنامہ ہی وہ مخزن ہے جسکی سی جامع کوئی تصنیف آج یورپ بھی پیش نہیں کرسکتا۔ نوٹ:۔ ترقی علوم کا شوق اس عہد میں اتنا بڑھا کہ سلطانوں اور وزیروں سے گزر کر امیروں تک پہنچا۔ مسند علیخاں ایسا ہی ایک امیر جسکی ساری عمر اور کل دولت اشاعت علوم و فنون ہی میں صرف ہوئی۔ اسکا دستور تھا کہ جب اس کے نوکروں میں سے کوئی مرجاتا تو اس کا وظیفہ اسکے وارث پر جاری ہوتا اور وارث نہونے پر متوفی کی بی بی کے لئے بالک کو اس شرط پر دیا جاتا کہ یہ اس یتیم کی تعلیم و تربیت پر صرف ہو۔ اس کوشش میں فنون سپہ گری بھی داخل تھے یہ تھی اس زمانہ کی تعلیمی فیاضی (دیکھو واقعات مشتاقی) [3] دوسری زبانوں سے فائدہ اٹھالینا بھاشا کی فطرت میں داخل ہے اسکی ایسی طبیعت روکی نہیں جاسکتی تھی۔

اس لئے بشوق آگے بڑھی اور فارسی کو سر اور آنکھوں پر جگہ دینے لگی دونوں جانب کے خلوص و کشش نے زور کیا اور فارسی و بھاشا آخر ساتھ ساتھ چلنے اور بڑھنے لگی۔

اس دوا دوی میں بھاشا فارسی پر سبقت لے گئی اور اپنے اصول و ساخت[1] توڑے اور بدلے بغیر چل نکلی۔ اپنے ساتھی (فارسی) کی سرکار سے رفتہ رفتہ اُس نے وہ کل لوازمات اور ضروریات زندگی کے وہ ساز و سامان حاصل کر لئے کہ اسکی دوکان کا خریدار و گاہک اور طرف کا محتاج نہ رہا۔ اس کا بازار عام و وسیع ہو کر گرم ہوا اور آخر وہ اردو بنا جسے دیکھکر ترکی زنگ اور مغل شرمندہ رہ گئے۔

یہ سکندر کی خوش نیتی تھی کہ ہماری بھاشا کی ایسی ترقی صرف اسکی ذات سے منسوب[2] ہو گئی! اور یہ امیر تیمور کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کی اردو اس کے نام کے ساتھ وابستہ[3] سمجھی گئی اور نہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ صدی دو صدی کی حکایت نہیں بلکہ پورے آٹھ سو برس کا دلچسپ قصہ و فسانہ ہے! اور ماہرین زبان (فلولوجسٹ) جانتے ہیں کہ شجر زبان کسی بھان متی کا درخت نہیں ہوتا بلکہ وہ نیچر و قدرت کی ایسی عظیم الشان نشانی ہے جو دنیا کے سب سے بڑے اصول یعنی قاعدہ ایوولیوشن (ارتقاء) کے موافق بہت آہستہ آہستہ ترقی پا کر ایک وقت خاص میں سایہ دار و پائدار ہوتا ہے اور اگر آپ نظر کریں گے تو اس ترقی یافتہ بھاشا، یعنی اپنی اردو کو بھی اسی قاعدہ کے ماتحت پا کر اسکی عمر اور اسکی بزرگی و استحکام کو بآسانی سمجھ سکیں گے!!

---

[1] بھاشا صرف و نحو جس پر کسی زبان کا مدار ہوتا ہے۔ بدستور قائم رہی [2] دیکھو گارسی د تاسی (فرنچ) کا تذکرۂ شعرائے اردو (دی ہندوستانی لٹریچر)
[3] دیکھو انسائیکلو پیڈیا۔ ذکر ہندوستانی زبان۔ ۱۲

# مغل اور اردو

مغل! یہ وہی مغل ہیں جو اس باغ ہند کے آخری باغبان کہلائے اور جنکی ریاضتوں نے اُسے گلزار بنایا اور تین سو برس کی عرق ریزیوں کے بعد جن کے اقبال کی بہار پلاسی کے میدان میں آخر خزاں ہو گئی!

امیر تیمور اس گھر کا وہ پہلا صاحب قران[1] ہے جس کے قوی بازوؤں نے دو ملکوں کے ستاروں کو کھینچ کر پھر ملا دیا۔ خاندان تغلق کے سرنگوں ہونے پر اس گیتی ستان کے قدم[2] ادھر آئے اور اسکی پولاد تن[3] و پنبہ پوش قوم اس نرم و گرم زمین پر یکساں

---

[1] امیر تیمور کا لقب صاحب قران اول تھا (شاہ جہاں صاحب قران ثانی کہا گیا) اور اسی کی وجہ سے ترک پھر ادھر آئے۔
[2] [illegible] [3] ترکوں کی تصویر سے سخت سرانے بوغا سخت کوش ÷ برہمہ پولاد تن و پنبہ پوش
روئے تو آتش کلہ از پشم میش ÷ آتش سوزاں شدہ با پشم خویش۔ (قران السعدین خسرو)

**نوٹ**:۔ اردو بے شک (چھاؤنی) ترکی ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ امیر تیمور ہی کی بدولت یہ لفظ یہاں پہنچا قرین قیاس نہیں۔ یہاں ترکی خاندان حکمران رہ کر ترکی پھیلے ہوئے اور ترکی اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ تیمور تو برس سوا برس سے زیادہ ہند میں رہا ہی نہیں اور وہ بھی کہیں پیلانی مقیم نہیں ہوا بلکہ فتوحات میں مشغول اور ہمیشہ سفر ہی میں رہا اسے یا اسکے لشکر کو اختلاط زبان سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ لفظ بہت پہلے سے یہاں مروج تھا۔ انسائیکلو پیڈیا نے ایک قصہ کو (میر امن صاحب باغ و بہار) کی سند سے اردو کو صاحب قران کا تحفہ سمجھ لیا مگر چہار درویش ہی کب مستند ہے۔

یہی حال سکندر لودی کا ہے کہ تعلیم کو عام کر دینے کی وجہ سے وہ ایک مخلوط زبان (اردو) کا بانی سمجھ لیا گیا۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی جہت سے فارسی یہاں عام ہو گئی اور بھاشا کو اس سے بڑی مدد ملی لیکن جیسا کہ دکھایا گیا ہے بھاشا اپنا ظاہری لباس بدلنے کے لئے عربوں کے وقت اور چھ سات سو برس سے تیار ہو رہی اور ایک مخلوط زبان اردو آپ سے آپ بن رہی تھی حاکم و محکوم کا شیر و شکر ہو جانا بھی آج کی نہیں بہت عرصہ کی بات ہے۔ اسے صرف اکبر سے منسوب کر دینا خوش اعتقادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

جمی اور کھڑی رہی۔ اس کا اردو دلی کو زیر زبر کرتا، ہر دوار پر چڑھتا اترتا اور پنجاب کے منقلب کرتا ہوا گھر لوٹا تھا۔

ایسے طوفان میں قومیں اور زبانیں ملتی نہیں بلکہ بکھرتی ہیں اور اگر لودی نہ سنبھالتے تو یہ ہلچل ہمارے شیرازہ کو نہ معلوم کب تک پراگندہ رکھتی۔ سکندر لودی کا احسان کہ ترقی ارتباط و اتحاد کی راہیں اس نے پھر نکال دیں مگر افسوس کہ اسکی زندگی کی طرح اسکی ترقی عمر بھی محدود رہی! ابراہیم اس کا خلف الرشید نہ تھا اور معاملات میں پھنسا اور آخر پانی پت کے (تاریخی) میدان میں سلطنت و جان ہار کر پردۂ خاک میں چھپ گیا۔ بابر کی جیت اور مغلوں کی نام آوری شروع ہوئی اور ترکوں کا آفتاب درخشاں ہونے لگا۔

بابر تلوار ہی کا دھنی نہیں بلکہ قلم و زبان کا بھی دھنی تھا۔ ادب و شاعری اسکی فطرت میں تھی۔ جب اُسے دیس نکالا ہوا اور تاشقند پہنچا تو وہاں سکار و شاعری ہی اس کے دو بہترین مصاحب تھے۔ کوہ و بیاباں میں تیر و تفنگ چلاتا اور آبِ رواں کے کنارے بیٹھ کر غزلوں سے جی بہلاتا اور عالمِ سرور میں کہتا ؎

نوروز و نوبہار و مے و دلربا خوش است[1] بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسی پر جوش طبیعت پر اس چمن کی سیر ایک اور تازیانہ تھی۔ وہ سودا یہاں بڑھا اور اپنے پرانے مشغلہ کو ہمیشہ تازہ کرتا رہا۔

سکندر (لودی) کے بعد اور نو سو تیس ۹۳۲ ہجری اور پندرہ سو چھتیس ۱۵۳۶ عیسوی کے یادگار سن میں ہمارے ملک کی زبان کیا تھی؟ اسے ہم فردوس[2] مکانی کی زبان سے

---

[1] دیکھو واقعات بابری از خانخاناں [2] فتح پانی پت و شکست ابراہیم لودی [3] فردوس مکانی بابر کا لقب تھا

سناتے ہیں ایک مقام پر جب اس کے ایک نامی سردار نے شکست کھائی اور یہ خبر اس نے پائی تو اس کا ذکر اپنے تزک میں کرکے لکھتا ہے کہ سردار کی یہ پسپائی قابل عفو ہے غیر زمین غیر کفو ہی نہیں بلکہ غیر زبان سے مقابلہ۔ نہ ہم یہاں کے بول سمجھ سکتے اور نہ وہ ہماری زبان جانتے ہیں! ! پھر ایک جگہ آگرہ کے ذکر پر کہتا ہے کہ میرے آدمیوں کے لئے یہاں کی زبان نئی ہے اور اس سے وہ بھڑک رہے ہیں۔

یہ دو شہادتیں اتنا سمجھ لینے کے لئے کافی ہیں کہ اس وقت یہاں وہ زبان دائر و سائر تھی جو ان ترکوں کے لئے غیر تھی جنکی روزمرہ فارسی ہو رہی تھی۔

غور کرنا چاہئے کہ غیر ملکیوں کو یہاں جمے ہوئے نو سو برس ہو چکے۔ وہ مالک الملک بنے ہوئے تھے قانون اور ہر طرح کا اختیار ان کے ہاتھوں میں تھا وہ جب چاہتے زبان کی کایا پلٹ دیتے مگر نہیں وہ اس زمین کی آب و ہوا سے آشنا ہو چکے اور خوب جانتے تھے کہ خلاف فطرت کام کا نام ظلم اور زبردستوں کی گردن کشی ہے انہوں نے یہاں کی زبان کبھی نہیں کھینچی بلکہ اسے چاہتے سیکھتے اور یوں رعایا کا دل ہاتھ میں لئے رہتے تھے؛

بابر اس معاملہ میں اپنے پیشروؤں کا مقلد اور خلف الصدق تھا وہ خود ادیب و شاعر تھا اور اسی وجہ سے دوسری زبانوں کی قدر کرتا اور ان کا ادب ملحوظ رکھتا تھا۔ یہاں آکر اپنی رعایا کی زبان اس نے سیکھی اور اپنے روزمرہ میں داخل کی اس کے تزک کو پڑھو کس بے تکلفی سے ہندی و ترکی کا جوڑ ملاتا اور یہ فصاحت سے ا

---

لہ دیکھو فتح قلعہ ملوٹ کا حال اور دولت خاں کا بابر پاس آنا جب ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تو بیچ میں ترجمان کھڑا کیا جاتا ہے جبکہ مسلمانوں کا حال یہ تھا تو یہاں کی اور قومیں تو فارسی سے اور دور ہونگی!

ادا کر جاتا ہے!

وہ ہمہ گیر شاعر بادشاہ اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ ہماری زبان کو خلعت نظم بھی بخشتا ہے اس کی رنگین طبیعت نے ایک مرتبہ اپنے تخیلات و جذبات کے پتلے کو ترکی خرقہ اور ہندی جامہ ساتھ پہنایا اور شوخیوں کے ساتھ اُسے محفل میں یوں جلوہ دیا[۱]

مجکا نہوا کچ ہوس مانک و موتی ۔ نقرا اہلیغہ بس بولغوسیدور پانی دروتی

بادشاہ کہتا ہے کہ مجھے یاقوت اور موتی درکار نہیں فقیر مست چوں ایک گردہ نان اور ایک کوزہ آب بس ہے۔ آپ کی اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظل اللہ کے منہ سے نکلا ہوگا تو نہ معلوم محفل کا کیا رنگ اور درباریوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتنی واہ واہ ہوئی ہوگی اور پر مذاق وزرائے دولت نے موتیوں کے کتنے طبق وارے ہونگے اور اسکی رعایا اپنے بادشاہ کی زبان سے اپنی بولی سن کر کس طرح خود کو

---

[۱] بابر کا یہ اردو شعر اسکے ایک ترکی رسالۂ عروض میں (جو سرکار رامپور کے کتبخانہ میں محفوظ ہے) خود اس کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے جس پر خانخاناں سے لیکر اکبر شاہجہاں تک کی مہریں اور دستخط ہیں۔ بحر کا نام ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف اور تقطیع یہ ہے :-

| | | | |
|---|---|---|---|
| مجکان | ہوا کچ ہ | وس مان | ک موتی |
| مفعول | مفاعیل | مفاعیل | فعول |
| نقرا ہل | غ بس بلغو | سدر پان | دروتی |
| مفعول | مفاعیل | مفاعیل | فعول |

مکرمی جناب حافظ احمد علی خانصاحب (مہتمم کتبخانہ) کا ممنون ہوں کہ انکی توجہ سے اسکی زیارت کر سکا رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۹۱۰ء کے ایک نمبر میں مخدومی ڈاکٹر راس (حال سکریٹری اورنٹل اکیڈمی لندن) نے بھی اس شعر کا فوٹو لیکر نوٹس کے ساتھ اسے درج کیا تھا۔ ہماری نظر جہاں تک ہے بابر سے قبل کسی نے اردو میں نظم کی ہمت و جرأت نہیں کی اسلئے جب تک اسکی تردید نہ ہو فردوس مکاں ہی اسکے موجد اور اس صنف کے باوا آدم مانے جائیں گے!

نثار کرتی ہوگی!

یہاں پر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مانک اور موتی ہندی ہے۔ غریب ترکوں کے یہاں موتیوں کا یہ مینہ کہاں برستا تھا کہ ترکوں کا وہ سنگار ہو سکتا اور نکی تخئیل میں وہ مدد دیتا!

یہ تو آپ کے اقبال کے وقت کی سچی کہانی ہے کہ بال بال میں پرو ئے جانے کے بعد ڈھیر کے ڈھیر موتی بچ رہے تو جوتیوں میں ٹانک ٹانک کر پہنے گئے ترکی بادشاہ کے الفاظ ہی نہیں بلکہ چار برس[ل] کے اندر اس کی تخئیل بھی دیکھئے۔ ہندی ہوگئی! دوسرے یہ کہ وہ پروشیوں کا بادشاہ اور ہنس (جرمن) کا شہزادہ تھا کہ فرعونیت دکھاتا اور اوتار بنتا۔ بلکہ وہ ہندی بادشاہ تھا اس لئے شاہی سے زیادہ فقیری بھائی اور اس روپ میں اپنا احوال کہہ سنایا اور یہی وہ اسلامی ہندی اصلی شاہی کیرکٹر ہے جسے فردوس مکانی کچھ عجب شان سے دکھا گیا!!

# مہابلی جی اور اردو

جو زبان بادشاہ کے منہ لگ چکی ہو اس کا سلطنت کے دودھ سے پلنا کیا بڑی بات تھی؟ ایسا ہی ہوتا۔ مگر بابر کی عمر نے وفانہ کی اور ہمایوں[ل۲] برگشتہ

[ل] بابر یہاں آنے کے بعد صرف چار برس زندہ رہا ۱۵۳۰ء واقعی ہمایوں کے سے سخن رس کو اگر موقع وطمینان ملتا تو نہ معلوم اتحاد و ترقی زبان کے لئے کیا کر جاتا جس نے کامران مرزا کو اسکی ایک غزل ـ ۵

کامران تا کہ جہاں راست بقا ۔ خسرو دہر ہمایوں بادا

کے صلہ میں حصار فیروز بخش دیا ہو وہ یہاں کے کوئی اور شعرا کو کیا کچھ نہ دے جاتا۔ یہ خود بھی شاعر تھا فلسفیانہ واخلاقی رباعیاں اسکی دیکھنے کے قابل ہیں۔ ریاضی داں بھی بڑا تھا دلی میں رصدخانہ اس کا مشہور تھا اور اسی کی سیڑھیوں پر سے اگر کر مرا۔ از بام افتاد تاریخ موت ہے۔

تقدیر رہا! اور شرنوں کے ساتھ یہ شرف بھی اکبر ہی کے لئے اٹھا رکھا گیا تھا۔ جب وہ تخت پر ہو کر بیٹھا تو ادھر بھی متوجہ ہوا۔ بکرما جیت کا وقت یاد آیا اور اپنے دربار کو بھی نورتن[1] سے سجایا۔ چار ایوان[2] کھڑا کیا گیا اور وہاں حکمت و ادب کا درس دیا گیا۔

اس مدرسہ میں چھٹی ملتی تو فارسی ہندی کتاب کھلتی اور دونوں زبانوں کا تال میل شروع ہو جاتا۔ کبھی مہا بھارت کا میدان نقیب خاں کے سپرد ہوتا اور اسے رزم نامہ کا خطاب ملتا اور کبھی رامائن کی کتھا کہی جاتی اور کشن گنگا دھر اور بھیش کے ساتھ ملائے۔ بدایونی کی زبان بھی صاف کی جاتی۔ امیر حمزہ کی داستان ختم ہوتی اور ہری بنس کا قصہ چھڑتا اور ملاشیری۔ شری کشن جی کا نام جپتا آج سنگھاسن بتیسی کی پتلیاں ناچتیں، حکمت کا راگ چھیڑتیں اور خرد افزا سمجھی جاتیں۔ تو کل کلیلہ و دمنہ کے طلسمی حیوان گویا ہوتے۔ چٹکلے، لطیفے کہتے اور عیار دانش بنتے۔ کبھی لیلیٰ مجنوں (عربی) اور شیریں خسرو (فارسی) بدیسی سمجھ کر محفل سے اٹھائے جاتے اور انکی جگہ

---

[1] نورتن۔ نو تو ۹۔ رتن جواہر آنکھوں کی پتلی بکرما جیت نے بھی ایسے نو جواہر فضلاء حکماء شعراء جمع کیے تھے۔

[2] فتحپور سیکری میں اکبر نے چار ایوان اور ایک محل بنوایا تھا جس میں علماء فضلاء جمع ہو کر علمی مباحث میں مصروف رہتے اور بادشاہ اس مجلس کا صدر ہوتا۔

نوٹ:۔ بابر کو جوانی سے بن دیکھے ہندوستان کا عشق، یہاں کی خاک سے الفت اور یہاں کی خاص چیزوں سے شغف تھا۔ کابل میں بیٹھا ہوا ہمارے آموں اور پانوں کو یاد کرتا ہے اور جب ایک ذریعے سے تحفتہً یہ چیزیں ہاتھ لگتی ہیں تو خوش ہوتا اور شکر بجا لاتا اور اس سے نیک شگون لے کر ہند کی طرف بڑھتا ہے۔ دیکھو تزک بابری۔ بابر خود فاضل اور فضلا کا رتبہ داں اور وہ خوش شاعر اور شعرا کا قدرداں تھا۔ عروض میں ایک رسالہ اور ایک مثنوی مبین اسکی یادگار میں سے ہے وہ خوش نویس بھی تھا اور ایک رسم الخط ایسا ایجاد کر گیا کہ خط بابری اس کا نام ہی پڑ گیا۔

سدیشی نل دمن لیتے۔ زلیخا کی ملک رانی دروپدی کو ملتی۔ اور زبیدہ کی حرم سرا سیتا جی کے نیگ لگتی۔ فیضی مودب ہو کر لیلاوتی کا حساب پیش کرتا تو مکمل خاں ورانو ہو کر یا جک کی شکل و ہیئت بتاتا۔ سرہندی (حاجی ابراہیم) آداب بجالا کر آرتھر ویدا کی حکمت سناتا اور خانخاناں (عبدالرحیم) دعائیں دیکر جوتش سے نیک لگن اور شبھ گھڑی بناتا۔ غرض یہ چرچے اور یہ قصے مہینوں نہیں برسوں رہے اور محفل اور دربار شاہی سے نکل کر ہزاروں اور عوام کے کانوں تک پہنچے ان ہی نسخوں نے رفتہ رفتہ خیالات پلٹے اور دو قوموں کے سروں کو اکٹھا انکی زبانوں کو ایکا اور ان کے تخیلات کو یکسو کر دیا!

بادشاہ خوش اور رعیت پھولوں نہیں سماتی۔ ظل اللہ کو مہابلی[1] پکارتی اور اس کے درشن کو مکت (نجات) جانتی۔ مہابلی جی سونے روپے میں تلتے۔ ملا (طلا) دان کرتے، برہمنو کی گود بھرتے اور انکی دعائیں لیتے! شمع کافوری بجھتی۔ اکاس دیا جلتا اور مصلا آشن سے بدلتا نوروز کے رنگ میں ہولی کھلتی اور شب برات دوالی گلے ملتی!۔

جہاں رسم و رواج کی پگڑیاں یوں بدلیں وہاں زبانوں کو ملتے اور بدلتے کتنی دیر! بھاشا سے اخلاص اتنا بڑھا کہ فارسی کرنگ (اسپ) کا کاف[2] کھٹکا اور اور بدی کی علامت سمجھ کر گرا یا گیا۔ ایسی بدی شاہی اصطبل کو آخر کرتی اس لئے کرنگ، سرنگ بنا کر کھڑا کیا گیا الہ آباد گنگا جمنا کے سنگم پر تھا۔ ماگھ میلہ میں اشنو کا نام وہاں لیا جاتا تھا، اس مناسبت سے وہ الہ باس پکارا اور یوں اردو بنایا گیا!

---

[1] مہابلی۔ بزرگ و برتر [2] بھاشا میں حرف کاف بدی کی علامت ہے۔

ازاں قبیل قوم اور زبان کی اصلاح و ترقی کے لئے ایسے کھیل ہر گھڑی کھیلے اور فارسی ہندی کے جوڑ دان پتلے بیٹھے بیٹھے کھڑے کئے جاتے!

بادشاہ کی ایسی غربا نوازی اور رعایا پروری نے مومن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل کی وفاداری کو اور چمکایا۔ ان کے حساب میں شاہی زبان کی پوجا کا یہی وقت نکلا۔ تمام قلمرو میں فارسی کے آداب و خیال کا فرمان و پروانہ گیا۔ تعلیم عام[1] ہوئی۔ شودر[2] تک دوات پوجا کرنے لگے اور فارسی ہندی کی گنگا جمنی مسندیں بچھنے اور سکندر (لودی) کے وقت کی برکت یاد آنے لگی۔

بادشاہ اس یک جہتی کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا، باغ باغ ہوتا اور اپنی تدبیروں پر ناز کرتا۔ اسی دوران میں اگلی پچھلی باتوں پر نظر کر کے اس عقدِ اتحاد کو ہمیشہ ہمیش کیلئے مضبوط تر و محکم تر کر دینے کا خیال آیا اور وہ ہمہ تن ادھر متوجہ ہو گیا۔

ملائے بدایونی[3] لاکھ گھوریں اور نظر لگائیں مگر جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا راجہ مان سنگھ و بیربل ہی ہمارے ہمراہ نہیں بلکہ ابو الفضل و فیضی کے ساتھ فتح اللہ

---

[1] سکندر کے بعد دوسری مرتبہ تعلیم عام ہوئی۔ ابو الفضل اس وقت کے نصاب کو یوں لکھتا ہے اخلاق، ہندسہ، نجوم، جیومیٹری، ہیئت، اکونمی، سیاست مدن، فزکس، منطق، نیچرل فلوزفی، طبیعیات، مذہب و تاریخ ہند و مسلمان ایک مکتب میں ساتھ پڑھتے اور اسطرح قومی اختلافات مٹتے رہتے۔ ہندوؤں کو علاوہ مذکورہ بالا علوم کے دیاکرن، ویدانت اور پتن جلی بھی پڑھائے جاتے۔ طالبعلم پر کوئی جبر و دباؤ نہ تھا جس فن کے مناسب اسکی طبیعت ہوتی اسے اس نے حاصل کیا اتنا لکھکر ابو الفضل یہ کہتا ہے کہ اس طریقۂ تعلیم نے بیحد فائدہ دکھایا اور اسکی بدولت ایسے ایسے فضلا نکلے جو واقعی ملک و سلطنت کے لئے باعث فخر ہیں۔

[2] ہندوؤں کے وقت میں شودر کو پڑھنا لکھنا منع تھا۔ مسلمانوں نے انہیں یہ آزادی بخشی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ہمارے کایستھ شودر ہی ہیں۔ دوات پوجا کی رسم تو اب تک ایسی ہے یعنی سال میں ایک دن وہ اپنی تعلیمی آزادی کی خوشیاں کرتے اور دوات قلم آگے رکھکر اسے پوجتے ہیں اور واقعی یہ چیز ہے بھی پوجنے کے قابل۔

[3] ملا عبد القادر بدایونی صاحب تاریخ بدایونی۔ یہ ملا صاحب اکبر اور اسکے اراکین کے ہر فعل سے جلتے ہیں خود نورتن کے شریک ہیں مگر ہر رتن سے کٹے جاتے ہیں سلیم کی یہ شادی بھی ان کے لئے بھاگوان نہیں اور ایسا عقدِ اتحاد سازوار نہیں۔

اشیرازی) بھی ہمارے شریک ہیں! یہ عقد اتحاد بندھے گا اور ضرور بندھے گا۔ ہندو مسلم رشتہ مضبوط ہوگا۔ شہزادہ سلیم دولہ بنے گا۔ بادشاہ خود بیاہنے جائیگا۔ رجپوتوں کی عزت بڑھے گی۔ برات سجے اور رچے گی۔ منڈھا چھولیا جائے گا اور خوشی کا یہ گیت گایا جائیگا

پربت بانس کٹا موئے بابل نئے کا منڈھا چھواؤ رے
منڈھے اوپر کلس برا جے دیکھیں راجہ راؤ رے

ان بولوں کے ختم پر دلہن کا چنڈول آئے گا۔ بادشاہ آگے بڑھے گا دولہ کو بلائے گا اور پالکی کو خود کندھا لگائے گا! سب کا دل بھر آئے گا۔ راجہ راؤ سامنے سِنیں گے۔ ہاتھ باندھ کر اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کریں گے اور بھرے دل سے کہیں گے ؎ ہماری (ہماری) بیٹی تمہارے محلوں کی چیری (ونڈی) ہم باندگلام رے!

شہنشاہ اس پر متاثر ہو کر جواب دے گا۔ نہیں نہیں ؎ تہاری (تمہاری) رے بیٹی ہمارے (ہمارے) محلوں کی رانی، تم صاحب سردار رے! (تم خود بڑے آدمی ہو)

اس پر ایک کوک پڑے گی۔ دلہن رخصت ہوگی اور رجپوتوں کی بیٹی اکبر کی بہو اور ملکۂ ہند بنے گی اور پاٹ رانی کہلائے گی۔

یہ سب کچھ ہوا! اور اکبر کو جہانگیری محل اس دن سے اتحاد کا راج گڑھ بنا۔ جہاں ہندی و فارسی مخلوط ہو کر شیر و شکر ہوئی اور پھر اچھی خاصی اردو بن گئی!

---

۱؎ ایسے ایسے سینکڑوں گیت ہیں جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں ان ہی میں سے یہ گیت بھی اس وقت کا کہا ہے جبکہ اکبر راجپوتانہ بیاہنے گیا اس سے اس وقت کی معاشرت تہذیب رسوم و زبان کے عقدے حل ہوتے ہیں جنہیں دلی اور خصوصاً قلعۂ معلی سے واسطہ تھا شاہی تقلید پر ان کے گھروں پر ایسے ایسے گیت شادیوں کے وقت اب تک گائے جاتے تھے اس خاص گیت میں محل کا قلام اور صاحب سردار کے الفاظ پر غور کرو تو یہی اردو ہے جو اس وقت رائج تھی!

# سلیم اور اُردو

بابر کے بعد اور اکبر کی پنجاہ سالہ سلطنت میں ملکی زبان نے جو نیا جوڑا پہنا اور حاکم و محکوم دونوں کی دستار کا جیسا طرہ وہ بنی اس کا ایک مختصر سا نمونہ بھی پیش ہو چکا اور اس سے اتنا سمجھ میں آ گیا کہ اب یہی زبان ہمارے راجاؤں کے گھروں اور شاہی محلوں کے اندر بے تکلف بولی جا رہی اور سلیم (جہانگیر) کی مادری[1] زبان بھی اب یہی تھی جہانگیر کے محلوں[2] نے تعلقات اور باضابطہ کر دیئے اور اب روزمرہ فارسی نہیں بلکہ یہی ہندی ہو رہا تھا۔

خرم (شاہجہاں) کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں بلکہ ہندوانہ تھیں۔!

یہ پیدا ہوا تو ساری چھوٹی رسمیں برتی گئیں۔ زچہ خانہ تک گایا گیا دائی جی شہزادے کو گود میں لئے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں۔ موتیوں کے تھال سامنے ہیں مگر ان کے بھاویں کچھ نہیں لگتا۔ ایک ناز کے ساتھ سنا سنا کر کہتی ہیں کہ ؎

مانگے ہے جودھا جی کا راج  لَلا جی کا نال نہ چھوا ئے
تھال بھر موتی جودھا نی لائیں  وہ بھی نہ لیوے یہ دائی!

---

[1] جہانگیر کی ماں راجپوتانہ کی رانی تھی جس کا خطاب مریم زمانی تھا۔ وہ ہمشیرہ والدہ اکبر مریم مکانی کے ستاری اسکی رحلت پر جہانگیر بہت افسردہ ہوا اور اپنے تزک میں لکھتا ہے۔ امید اللہ تعالیٰ ایشان را لغریق رحمت خویش گرداناد۔

[2] جہانگیر کے دو ہندو محل تھے اول راجہ بھگوان داس کی بیٹی اور دوسری مہاراجہ اودے سنگھ کی نور نظر۔ خرم اسی کے بطن سے لاہور میں پیدا ہوا تھا۔

یعنی میں تو جبتک رانی جی کا آدھا راج پاٹ کھا نہ لونگی چھوڑونگی نہیں اور شہزادے (للاّجی) کا نال کاٹنے والی نہیں! میرے آگے یہ تھال بڑا مال نہیں اسے اٹھا رکھو!

زبان اور اپنی اردو کی صاف و صحیح تصویر اگر دیکھنا چاہو تو انہیں بولوں کے شفاف آئینوں میں دیکھ سکو گے! یہی زبان اور خوشی و غم کے یہی انداز اشراف گھرانوں میں ابتک باقی ہیں اور جہاں ہماری عورتیں اسپتالوں اور خیرات خانوں کی نرسوں کے حوالے نہیں کی جاتیں وہاں یہ چہل پہل ہنوز باقی ہے! انہیں جاننے والے سمجھتے ہیں کہ ہماری اردو کھلے بازاروں اور تنگ چوگوشوں کی ہوا کھا کر ہم تک پہنچی مگر نہیں اس نے تو محلوں میں پرورش پائی اور ہمارے رجواڑوں اور شہزادوں شہزادیوں کی وہ صحبت اٹھا کر اور ادب قاعدہ سیکھ کر باہر نکلی اور ہماری ہم جلیس بنی ہے! قواعد اردو

جہانگیر کے بے تکلفانہ اور شاعرانہ انداز کچھ چھپے ہوئے نہیں وہ صاحب قلم اور اپنے تزک کا مولف تھا۔ زبان کا شوق اور اسکی اصلاح و ترقی اس کی بات بات سے ظاہر ہے جو نور جہاں کی بغل میں بیٹھا بادۂ ارغواں کو رام رنگی[1] کہکر یاد کرتا ہو وہ اپنی پاٹ رانی کے آگے کتنا کھلتا اور آخر کس روزمرہ میں باتیں کرتا ہوگا؟

ایک مرتبہ وہ سفر کشمیر میں ہے۔ جاتے جاتے بیچ ہزارا ایک مقام پر اترا اور وہاں کی فضائیت اور حالات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا اور کہتا ہے کہ واقعی یہاں کی یہ کہاوت (جو عرصہ سے مشہور ہے) کتنی سچ ہے۔ ؎

---

[1] طالب آملی اس پر کہتا ہے ؎

نہ ایم منکر صہبا و لیک می گویم ... کہ رام رنگی ما نشۂ دگر دارد!

پچ ہزار اکنگا بھلیاں دھنی کھوب گائیں    سورسیکرتی گھوڑ بھلے اور ہشت نگر کے دھائیں
یعنی پچ ہزار کے گیہوں اور دھنی (مقام) کی گائیں خوب ہوتی اور اسی طرح
سورسیکرتی کے گھوڑے اور ہشت نگر کے چاول مرغوب ہوتے ہیں!

## اُردُوئے معلّیٰ

شاہ جہاں کو زبان اردو پر وہی حق و دعویٰ ہے جو کسی صناع کو اپنی صنعت وکاریگری پر ہوا کرتا ہے اور جبتک یہاں کی یہ دو بڑی قومیں ہندو مسلمان زندہ ہیں اپنے اس ہندی شہنشاہ کی اس بے مثل صناعی اور اپنی قومیت کی نشانی کو یاد کرکے اسکی رُوح کو خوش کرتی رہیں گی!

تاج حجا (جمعہ مسجد اور قلعہ معلیٰ کی شاندار عمارتوں کے ساتھ اس اردوئے معلیٰ کی یادگار عمارت بھی اسی فیاض وسیر چشم بادشاہ کے مبارک نام سے قائم رہیگی یہ اردو کی گود میں پیدا ہوا اور اسی کے دامن میں پلا۔ اذاں کے بعد جو پہلی آواز اسکے کانوں میں پڑی وہ اسی زبان کی صدائے خوش تھی! زچہ گیری اور چھٹی چھلّہ کے گیتوں یہ اگو اور لوریوں کے دھیمے سروں میں اس نے اپنی اسی مادری زبان کے الفاظ سنے اور یہ اسی کا اثر تھا کہ خدیجۃ الزمانی کی گود میں رہکر بھی جب زبان پھوٹی تو دادا اکبر کو شاہ بابا اور باپ کو شاہ بھائی کہنے لگا۔

شاہ جہاں آباد بن چکا اور بادشاہ کے مبارک قدم اِدھر آئے تو اردوئے معلیٰ کا شیرخوار بھی دامن دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ آیا اس دن سے یہ طفل لال قلعہ میں اور شاہ جہاں کے سے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا۔

لہ (دیکھو تحت صفحہ ۵۷) 

اس بچہ کے ساتھ صاحب قرآن اول کے پوتے بابر کے پیار و اخلاص کا حال گذر چکا۔ اب اسی بابر کے پروتے صاحب قران ثانی کی اس توجہ کی حکایت بھی پڑھو جو خاندانی روایت قائم رکھکر اس معصوم کے حال پر مبذول رکھی گئی!

شاہجہاں نے اس شیرخوار پر صرف زبانی مہر و شفقت نہیں دکھائی بلکہ دلی الفت سے اسے گود میں لیا اور منھ سے منھ ملا کر بہتشا سے پیار کیا! جب شاہ قلعۂ آگرہ میں زچ ہوا تو گوشۂ تنہائی میں اپنے اس طفل زبان سے کھیلا اور جی بہلایا کرتا اور جب شجاع عالمگیر کے مقابلہ سے بھاگا اور دارالسلطنت سے دور ہوا تو اسکے اور بادشاہ کے درمیان یہی معصوم واسطہ بنا رہا اور ابواب کے ساتھ جب شاہ پر رسل و رسائل کا دروازہ بھی بند ہوا اور ریکوں۔ قاصدوں کے پیر توڑے گئے تو حضرت نے عالمگیر سے اس کا گلہ کرا بھیجا۔ شجاع کی تسلی اور امداد کی خاطر جو پرچہ پیغام حجرۂ شاہ سے جاری ہوئے تھے ان میں سے ایک شقہ شاہی کی طرح اورنگ زیب کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ باپ کی تادیب پر جواب لکھا اور رسم عبودیت بجا لا کر عرض کرتا کہ ہمارے دشمنوں (بھائیوں) پر حضرت کی نگاہ لطف و کرم ابتک باقی اور غلام کے خلاف ریشہ دوانیاں بدستور قائم ہیں۔ آن فرمان عالی کے در زبان اہل[1] ہند از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است!

آپ کی زبان کے سرچوں میں سے غالباً یہ نیا سرچ ہے یہ زبان ہندی شاہجہانی اردو ہے جو اس شاہ کی نسبت سے قلعۂ معلیٰ کی طرح اردوئے معلیٰ کے

(نوٹ متعلق صفحہ ۵۶)

ـــــ

[1] خرم پیدا ہوا تو اکبر خوش خوش اسے اپنی ملکہ خدیجۃ الزمانی کی گود میں ڈال آیا۔ وہ لاولد تھی اور خرم کو بیٹا بنا پالا۔ خدیجۃ الزمانی ننھیال مرزا کی بیٹی اور ترک تھیں انکو ہندو سے کیا نسبت

[1] دیکھو مراسلات عالمگیر و شاہجہاں

لقب سے مزین ہوئی اور اس سے آپ اپنی زبان کی بزرگی و ترقی کو بخوبی سمجھ سکتے اور اس بادشاہ کے ساتھ اسکی نسبت کی وجہ اب بآسانی معلوم کرسکتے ہیں!!

دارا ولیعہد سلطنت اور خوبوں میں صاحب قران ثانی اور ادب و لٹریچر کے شوق و ذوق میں اپنے بزرگوں کا خلف الرشید تھا! اسے تخت نصیب ہوتا تو اتحاد زبان کا نشان اور بلند ہوجاتا۔ بھاشا اور سنسکرت سے اس کا تعلق و اخلاص پوشیدہ نہیں دیدمت کو سمجھتا اور گیتا کا شیدا تھا جس نے اپانی شادش کو سرالاسرار بنایا اور جوگ وششتا کو فارسی جامہ بخش کر و دیا لی لی زبان کو چمکایا اور اپنے گرو بابا لال داس[1] پنڈت اور اپنے برہمن[2] منشی و دیوان چندربھان کے سے شاعر و ادیب کی مدد سے اپنی مادری اور باپ کی پیاری زبان کی کہاں تک خدمت نہ کرتا لیکن مشیت اس کے خلاف تھی اور اسکی انگوٹھی کے نشان پربھو[3] (غالب) کو دیکھ دیکھ کر ؎

زبس راجپوتاں پر کار جنگ گذشتند از جان با موس و ننگ
قبا داں قدر گشتہ در کار زار کہ شد بستہ راہ گذر بر سوار

مگر اس پر بھی اس کا نشان آخر سرنگوں ہی رہا اور اردوئے معلی کا علم اس وقت اور بلند نہ ہوسکا!

## عالمگیر اور اردوئے معلّیٰ

ترکی ہندی اختلاط اور صدیوں کے میل ملاپ سے بھاشا نے کیچلی

---

[1] دیکھو مکالمہ بابالال داس۔ [2] یہ وہی برہمن ہیں جن کا یہ مشہور شعر ہے۔
مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار بہ کعبہ بُردم و باز ش برہمن آوردم
[3] پربھو غالب کے معنی میں ہے دارا نے اس لفظ کو مبارک سمجھ کر اپنی انگوٹھی پر کندہ کرایا تھا۔

اُتار کر جو صورت نکالی اُس کا نام اردو ہے۔ اور پھر مغلی و رجپوتی سرکار دربار میں جس طرح وہ پوچھی گئی اور منصب عالی تک پہنچائی گئی عرف عام میں اردوئے معلیٰ کہتے ہیں! اس اردوئے معلیٰ اور عالمگیر نے ایک ہی گھر میں ہوش سنبھالا اور اس سے ایک کا دوسرے پر اثر محتاج بیان نہیں - عالمگیر اب ترک نہیں بلکہ اچھا خاصہ ہندی تھا۔ اس میں اپنے بزرگوں کے بہت سے اوصاف تھے اگر مید ان جنگ میں سرلشکر رہا تو اپنے دیوانخانہ میں بھی سر دفتر دکھائی دیا۔ زبان کا شوق اسمیں فطری و موروثی تھا اور جہانگیر و شاہجہاں نے اگر یہاں کے شعرا اور خصوصًا تلسی داس کو شرف حضوری بخشا تو کب کا ساربان اور کوی زمانہ ولیعہدی سے اس کے دامن سے لپٹا رہا اور یہ وہی نامی کب[1] ہے جس نے زبان شنکر جسونت سنگھ[2] سے گفتگو کی اور حق سفارت ادا کر آیا۔ زبان کے شوق اور یہاں کی بھاکھا سے اسکی الفت کی انتہا یہ ہے کہ جب بنگالہ سے ایک شخص اُس (بادشاہ) کا مرید ہونے آتا اور صلابت خاں میر توزک اسے حضور میں پیش کرتا ہے تو وہ (بادشاہ) اس پر مسکراتا اور عربی و فارسی شعر کی جگہ بے اختیار ایک پنجابی نظم اور کہاوت اسکی زبان پر جاری ہو جاتی ہے!

عالمگیر علوم و فنون کا سرپرست اور ادب اور انشا کا مربی تھا اور باخبر و مصنف دنیا اسے راجہ بھوج اور سکندر لودی کے بالمقابل سمجھے گی تو ڈرل کی

---

[1] پڑھو اس کے رقعات اور نثر میں نظم کا مزا اٹھاؤ [2] دیکھو عالمگیر کے خلاف جسونت سنگھ کی معرکہ آرائی کا حال [3] (دیکھو حاشیہ صفحہ ۶۰)

تعلیمی اسکیم اسکی توجہ کی ممنون اور یہاں کی تعلیم عامہ[۱] اسی کی فیاضیوں کی زیر بار احسان ہے۔ جبکہ طلباء کے لئے ایک آنہ سے لیکر آٹھ آنہ روز تک مقرر ہوا اور وظائف کا یوں مینہ برسا دیا جائے تو پھر کشت علم کیونکر سرسبز نہو اور تعلیم کا چرچا کس طرح گھر گھر اور عام نہ ہو جائے[۲]۔ اور اس کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ اس جگ کی اکنی اس کلجک کی اٹھنی پر بھاری تھی۔

اس مربیٔ علوم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ مقتضائے وقت کو سمجھکر اس ملک میں آج سے تین سو برس قبل بے طلب اس جبری تعلیم کی بنیاد بھی ڈالی جس کی اس وقت ضرورت دکھائی جا رہی اور جسے آپ کا ایک خیر خواہ[۳] اپنی آخری سانس تک مانگے چلا گیا ہے۔ جس وقت عالمگیر آپ کے بھائی بوہروں کی علم و تعلیم سے بے خبری کی حالت سنتا ہے بیچین ہو جاتا ہے اور فوراً معلمین و استاد مقرر کرکے ان تک بھیجتا ہے اور جب اس پر بھی دلخواہ رپورٹ نہیں آتی تو اپنے فرائض کو سمجھکر ان کے لئے جبری[۴] تعلیم کا حکم و قانون نافذ کرکے انہیں انسان اور دنیا میں جینے کے قابل بنا دیتا ہے جو علم و تعلیم کا ایسا حامی[۵] زبانوں کا ایسا سرپرست اور ادب و انشاء کا ایسا مربی ہو وہ اپنے بزرگوں کی یادگار اردوئے معلی کا کہاں تک خیال نہ رکھتا ہوگا اور گو وہ خود کہتا ہے کہ ؎

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹)

سه "ٹولی پسندی بادرہ" ۔ وینذی کھرے نیج تو چوہا کدن باولی کوگل باندھے ھیج الیتی چوہا بل میں نہ سمائے اسکی دم میں باندھے چھاج (سوپ) ہولی اپنے پتوں آپ بھاری ہیں کیا کسی کو مدد کر سکتا ہوں یہ کہکر حکم ہوا کہ اسے کچھ دے دلاکر رخصت کردو۔ دیکھو سوانح سال سی سوم [۱] دیکھو مسٹر کین کی مغل امپائر۔ [۲] دیکھو مراۃ احمدی از محمد خان۔ تاریخ فرخ بخش از محمد فیض بخش ۱۱۳۵ھ [۳] مرحوم گوکھلے۔ [۴] دیکھو انڈیا (انگریزی) جلد اول صفحہ ۲۷۷، ۲۷۸۔ [۵] اسے پڑھو ملا صالح اور بادشاہ کی علم و تعلیم پر گفتگو معلوم ہو کہ کسی یونیورسٹی کا کوئی فاضل چانسلر تقریر کر رہا ہے۔

غم عالم فراواں ست و من یک غنچہ دل دارم　　چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

لیکن اس پر بھی اسکی سلطنت کے باغ میں ایسے پھول ہم کو نظر آجاتے ہیں جو غنچۂ خاطر کو کھلا اور ہماری بزم کو جلا دیسکتے ہیں اور حق پوچھو تو یہی وہ گل سادہ ہیں جن کے بے میل رنگ میں ہماری سچی تصویر جھلکتی اور نظر آیا کرتی ہے۔

کچھ قبل ایک شادی کا منڈھا چھوایا جا چکا اور اس کے بعد ہی ایک ترجہ خانہ گوایا جا چکا ہے وہ خوشی و وصال کا ترانہ تھا زمانہ بدلتا اور اب جدائی و فراق کا فسانا سناتا ہے۔

عالمگیر دکن پر چڑھا ہوا ہے۔ لاؤ لشکر ساتھ ہے ہون کا لالچ مردوں کو بٹور کر ادھر لے گیا اور عورتیں گھر میں ہیں۔ برسوں گذر گئے دلی خالی اور سونی پڑی ہوئی ہے اور دلی والیان اکیلی، فراق کی راتیں گذار رہی اور دکھ بھر رہی ہیں۔ کہیں سے خبر نہیں آتی دل اداس اور قلب بیچین ہے اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو دکھن کی طرف منھ کر کے پکارتی اور اپنی بپتی نہیں گھر کا حال سناتی اور کہتی ہیں ؎

چھپرا پرانے ہو گئے کڑکن لاگے بانس ❊ دیکھو یہ گھر گرا یہ چھت آئی دبے اور مرے

جواب نہیں ملتا تو ہار کر اور گھبرا گھبرا کر کاگا کی خوشامد ہوتی اور اس کے ہاتھ سندیسا (پیغام) بھیجا جاتا اور گلہ کیا جاتا ہے کہ ؎ آؤں آؤں کہہ گئے بیت گئے بارہ ماس کیسے سچے اور وفادار ہو۔ ایک جگ گذر گئی اور خبر نہ لی! اس سے بھی خاطر جمع نہیں ہوتی تو کلیجہ اور پھٹتا اور اس میں سے آواز آتی ہے ؎

دلی سہر سہاونا اور دکھن برسے نیر　　سب کے کنتھ بٹور کے لے گئے عالمگیر

اس فریاد پر یہ روکھا پھیکا جواب ملتا ہے کہ ؎

بیٹھی رہو کرار سے من میں اکھو دھیسر اکبے بچھڑیں جب ملیں جب ہو ہرن عالمگیر

تو حوصلہ صبر اور رجا تار ہتا اور جینے سے یاس ہو جاتی ہے۔!!

یہی وہ زبان تھی جو اس صدی میں رائج رہی اور اسے سوا اردو کے کچھ اور سمجھنا زبان کے آثار چڑھاؤ اور اس کے مدارج سے بے خبری و لاعلمی ہے۔

## محکوم کا اثر حاکم پر!

حاکم زبانیں محکوم زبانوں سے بہت کم دبتی ہیں۔ عربی بھی فارسی سے زیر نہیں ہوئی۔ مگر ہند کی خاک بڑی عنان گیر ہے۔ اس نے ترکیوں، فارسیوں کا لباس ہی نہیں اتارا اور انکا ہتھیار ہی نہیں کھولا بلکہ انکی شمشیر زبان کو یہاں کا پتھر بھی چٹا چھوڑا۔!

بلا بہادر اپنے دیوالا و بلدیو میں بلرام جیت دلاس میں بھرتری اپنے بھجنوں میں بھاؤ نند داس امرت دھارا میں چند کوی پرتھی راج سارا میں اور بہاری لعل ست سئے اور اپنے مشہور دوہوں میں اگر حاکم وقت کی زبان بھی بول گئے تو کیا تعجب یہی مشہور بہاری آنکھ کی تعریف میں کہتا ہے ؎

امی ہلاہل مدھ بھرے سیت شیام رتنار جیت مت جھک جھک پت جہ چتوت یکبار

زبان کے لوچ، نیچرل شاعری اور اس کے لف ونشر پر تو بعد کو نظر کرنا اس وقت اس شام یعنی سانجھ کی بہار تو دیکھو اور اس ایکبار پر پھر ایک بار نظر تو کرو!! اور اسی طرح اگر پرراج لسی داس کی مثنوی راج بلاس میں چھتر پوس۔ مصر کرشن جی کے حال اور اپنی بیاس میں کبیر و نانک اپنے درود و وظائف میں کرشنا معاصر و معاون

ابوالفضل اپنی نئی گیتا میں لال کوی چترا پرکاش میں اور موتی رام قصہ مادھولال میں نابھاجی اکبری اور کیشوداس جہانگیری؟ اپنے خزانۂ دماغ میں سکۂ رائج الوقت کو بھی محفوظ کرنے لگے تو چنداں حیرت کی جگہ نہیں۔ اور بہاکوی (ملک الشعراء)[1] سندرداس کی سندر سنگار مشہور سورداس کی نل دمن اور واجب التعظیم تلسی داس کی راماین اور خصوصاً ان کے آبدار دوہوں[2] کے نیچوں میں اگر عربی و فارسی کے بھی جوہر چمکے تو تعجب خیز نہیں۔ مگر فارسی تیغ پر ہندی جلا البتہ حیرت انگیز ہے!

یہاں پر اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جب ایک قوم دوسری قوم سے بدل ملتی ہے تو اسکی ہر ادا بھلی لگتی ہے۔ معاشرت مغائرت کی قاتل ہے اور دو غیروں کو ایک کر دیتی ہے ان دو قوموں (ہندو مسلمان) کا بھی یہاں اسی طرح رشتہ جڑا۔ شاہ نے اپنا لباس اتارا تو رعایا نے بھی اپنا جامہ بدلا۔ مراد کو پہاڑی راجہ خطاب ملا تو مان سنگھ بھی مرزا راجہ بنا!

جائسی[3] پدماوت کو سراہنے اور عبدالرحیم خان خاناں کوئی نگر دوہوں[4] کو سرتاج بنانے بیٹھے تو ادھر ڈونگرمل اور چندربھان بھی اچھے خاصے شاعر ہو گئے

---

[1] بہاکوی (ملک الشعراء) سندرداس کو شاہجہاں بہت عزیز رکھتا اور ہمیشہ انعام و اکرام سے سرفراز کیا کرتا۔ سندر سنگار اسکی مشہور تصنیفات میں ہے بادشاہ کی فرمائش سے یہ سنگھاسن بتیسی کو بھاشا یا اسوقت کی اردو کے قالب میں لایا۔ یہ پرانی چیزیں ہند کے خزانہ سے نکلکر یورپ پہنچیں اور برلن برس میں ان کا بڑا ذخیرہ ہے دیکھو وہاں کی لبریری کے کیٹلاگ۔ [2] گھر لسو اس بچن ہٹ ہوئے کیتی بھنتک کلابھی کھولے گئی گریب گرام نرنا کو۔ بندے ت ہوئے ملیں جا گو سے ماما کو مانے کر کر لیے ہاتھ تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات
[3] ملک محمد جائسی پدماوت (لنکا کی رانی اور رتن سنگھ چتوڑ کے راجہ کی کہانی) کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی راگنی سورات بھی ہے مگر وہ مشہور نہیں ہوئی۔ [4] (دیکھو حاشیہ صفحہ ۶۴)

تالی دونوں ہاتھ بجی اور ایسی آواز پھر دنیا نے نہیں سنی۔

وہ آواز جو تین سو برس قبل گونج رہی تھی آج شاید مدھم پڑ گئی ہے یہ محفل کن رسوں سے خالی نہیں۔ ذرا چھیڑ ہو تو دل گرمائیں اور اگلی محبتیں یاد آئیں۔ دیکھنا ادھر سے بھی کوئی تکلف نہ ہوگا اور یہاں غیر نہیں یہاں دوست سمجھ کر تصرف ہوگا سب کے سب پہلے پہلے کٹار ہی سامنے آتی ہے کہ پرانی وضع کی نشانی اور یادگار وہ یادیں تازہ ہوتی ہے ۔ ۵

سر آں دو چشم گردم کہ چوں ہندواں رہزن ہمہ را بہ نوک مژگاں زدہ بر جگر کتارا

جدھر بہادر رجپوتوں کا خاص ہتھیار ہے۔ دیکھو طغرا کٹارے میں ان سمرقندیوں[۵۱] کو کیونکر چھیڑتا ہے۔

شیخ سوسن آنکہ دل می ربایند تشنہ ات ذات رجپوت ست دست بر جمدر کنند

متھرا یعنی برج کے سبزہ پر دل لوٹ پوٹ ہے۔ ٹھوکر کا بھی خیال نہیں مست شاعر

(بقیہ صفحہ ۶۳)

۴۹ خانخاناں کے دوہے مشہور ہیں جیسے ۵ نین سلونے ادھر مدھو کہو رحیم گھٹے کون میٹھا بھاوے لون پر اور میٹھے پر لون (یعنی نمکین آنکھیں اور لب شیریں بتاؤ رحیم میاں کون؟ موئی بھی نہیں سلتے کہ نمک کے بعد میٹھا اور میٹھے کے بعد نمک مزا دیتا ہے۔) دیکھو زبان ہی نہیں مذاق بھی ہندی ہے اور اخلاط کے یہی معنی ہیں یہ وہی فیاض عبدالرحیم خان خاناں تھا جن کا وسیع دسترخوان مشہور رہا اور یہ مثل ہوگئی ع خانخاناں جن کے کھانے میں تابنا قابوں و پیالوں میں سونے چاندی کے چھلے بتانے چھوڑ دیئے جاتے تھے کہ غریب نکالیں اور اسے بھی کھائیں اور ہمارے یہاں کونڈوں میں ابتک یہی دستور رہا مگر کونڈے چیلنے والے تو اب بھی بہت ہیں لیکن کونڈے کرنے والے کہاں مشہور میاں فہیم (کمائیں خانخاناں اڑائیں میاں فہیم) ان ہی کی ناک کے بال تھے اور یہ سننا دلچسپی سے خالی نہوگا کہ یہ میاں فہیم اصلاً برہمن تھے ع بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا ۵۱ رجپوت اور کچھ نہیں تو ترکوں کے سمدھی ضرور تھے!

شاعر آنکھ بند کئے اُدھر چلا جاتا ہے ؎

چوں زند بنر قہوا عرفیؔ از پائز ند حُسن — بہر زیب نطق مصحف خواں گل از برکند

عالیؔ بیچارہ کو جب یہاں کچھ نہیں تو سکھڑی مانگنے لگتا ہے۔ مگر دیکھنا منھ کیونکر کھولتا ہے ؎

اینجدا عالیؔ بیچارہ بہ ہند آمدہ ست — نازنین شوخ ظریف سکری میخواہد

عرفیؔ اپنی باو تند کو بھولتے اور ہمارے جھگڑے کو یاد رکھتے ہیں مگر کیا خوب یاد رکھتے ہیں ؎

درجا ئیکہ از شبنم گل گرد فشانست — آں باد کہ در ہند اگر آید جسکر آید

سالکؔ یزدی پلاؤ کھاتے کھاتے تھکے تو ہماری کھچڑی کی طرف بڑھے مگر بیچی نہیں اور بیٹ بجا کر کہنے لگے ؎

زسیر گشتتم زکجیرے ایام — ہوس یسم وزرہی دارم

واہ کیا خوب جوڑ ملایا اور کس مزے کی کھچڑی پکائی ہے! طالب آملی ایک مرتبہ جھوم کر جو اٹھے تو جہانگیر پر نظر جا پڑی اور ولایتی کو چھوڑ کر دیسی کا مزا لینے لگے جمائی لیکر فرماتے ہیں ؎

نہ ایم منکرِ صہبا ولیک می گویم — کہ رام رنگی[1] نشہ دگر دارد

کلیمؔ زور زبان دکھانے اٹھے تو یوں گرے کہ سنگ سنگھ سے توڑ بیٹھے شاہجہاں کا سامنا ہوا تو لگے خفت مٹانے ؎

سر راجپوتاں جگت[2] سنگ بود — کہ بر شیشہ نہ فلک سنگ بود!

[1] رام رنگی جہانگیری دو آتشہ ہے [2] دیکھو شاہجہاں نامہ ۱۲

اور تو اور اس ریلے میں ہمارے چند بھان بھی اپنی قومیت کا ٹیکہ مٹاتے اور بڑا منٹھر کی جگہ برہمن کا تلک لگائے لیتے ہیں۔ سنئے ؎

مرادلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار — بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور پھر مزا یہ کہ اب سب یوں ہی بولنے بھی لگے۔ چنتامنی کی تو خبر نہیں مگر ہمارے مالوجی کی تو اب یہی زبان ہے!!

## دوسرا دور مرہٹی یا دکھنی

یہاں کی مختلف بھاکھا اور زبانوں کے ذکر میں مہاراشٹری کا نام آچکا ہے اس بھاکھا کو اپنے صوبہ مہاراشٹر یعنی دکھن سے نسبت تھی۔ ملک دکن سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد اور ملک کافور کی حکمتوں سے بارھویں صدی عیسوی میں ہاتھ آیا۔ اور جیسے وہاں ایک نئی زبان (فارسی) اور ایک نئی معاشرت کا اثر پڑا۔ تاریخ دکھن کی سیر آخر ان ہی نتائج تک پہنچاتی ہے جو شمال ہند میں ہمارے ربط و اتحاد کے سبب سے پیدا ہوتے رہے۔ ان ہی اثرات سے وہاں بھی ایک انقلاب آیا اور مہاراشٹری بگڑ کر مرہٹی بنی اور نئے تعلقات سے وہ آخر دکھنی[1] کے موزوں خطاب سے سرفراز ہوئی

## دکھنی یا اُردو

آپ اپنی بھاشا کے اقتدار و فضلیت کا حال پڑھ چکے ہیں اردو اس کی قائم مقام تھی۔ اس لئے اس کے سامنے بھی کسی اور زبان کے چراغ کا جلتے رہنا آسان

---

[1] جو مرہٹی اسوقت رائج ہے وہ پرانی مرہٹی و دکھنی کی ایک غیر فصیح شکل تھی جسے اب آگے بڑھایا جاتا ہے

نہ تھا۔ ہند و دکھن کے تعلقات جب بڑھے تو دکھنی اور اردو بھی گلے ملیں ہمایوں کی فتح گجرات کے بعد اور سلطان بہادر کے زوال پر شمال و دکھن میں گہرا رشتہ قائم ہوا اور دونوں جگہ کی زبانیں ملنا اور پھٹنا شروع ہوئیں۔ یہ چونکہ مزاجاً دو نہ تھیں آخر ایک ہوئیں اور جب اردو کی سروری کا وقت آیا تو اپنے پرانے اقتدار کے باعث ملک دکھن کو بھی اس نے زیر اثر کر کے اس دکھنی پر قبضہ کر لیا اور یوں شمشیر و زبان بن بیٹھی!

## دکھنی دربار

انقلابوں کے بعد جب دکھنی ریاستیں (بیجاپوری) نظام شاہی وغیرہ علیحدہ و خود مختار ہوئیں تو ان کا نظام مملکت بھی شاہان ہند کے اثر سے آزاد اور ملکی اثرات کو جلد جلد قبول کرتا رہا۔ بوبوجی[1] و بھاگ متی[2] فارسی، مرہٹی رانیوں اور گنگو برہمن[3] کے سے مشیر ملک کی قوت و اقتدار سے نظام مملکت میں اور تبدیلیاں ہوئیں ملکی زور اتنا بڑھا کہ دفتر تک کی زبان دیسی (دکھنی) ہو گئی اور عادل شاہیوں[4] اور نظام شاہیوں[5] کے وقت میں گو ظہوری و محمد قاسم فرشتہ اپنا زور لگاتے رہے مگر ملکی زبان روز بروز بڑھتی ہی اور عام ہوتی ہی چلی گئی اور خیالات و جذبات کا اظہار بھی آخر اسی دکھنی

---

[1] بوبوجی مکند راؤ مرہٹہ کی بہن اور یوسف عادل شاہ کی منکوحہ تھی اس نے دکھن کے پولیٹکل تغیر میں بڑے ہاتھ لئے ہیں [2] بھاگ متی سلطان محمد قلی کی وہ معشوقہ ہے جس کے نام پر بھاگ نگر آباد ہوا جو بعد کو حیدرآباد دکن بنا [3] گنگو مرہٹی برہمن تھا اور یہ پہلا شخص ہے جو فارسی پڑھ کر بہمنی سلطنت کا مشیر بنا [4] ابراہیم عادل شاہ کے وقت میں دفتر مرہٹی یا دکھنی ہو گیا اور یوسف عادل کے زمانہ میں گو ایک قسم کی سلف گورنمنٹ قائم ہو گئی تھی [5] نظام احمد شاہ اصلاً برہمن تھا۔ یہی خاندان بھیرو کر کے مشہور رہا اور بعد کو بگڑ کر بحری ہو گیا۔ اسماعیل نظام شاہ کی ماں کوکنی تھی!!

میں ہونے لگا!

## دکھنی اردو کی شمالی اردو پر فضلیت

اردو کی ہزار سالہ تاریخ اب آپ کے پیشِ نظر ہے اور اس کے ملاحظہ کے بعد خیال جاتا ہوگا کہ جس زبان کو باہر سے منھ لگایا اور جو شاہجہاں کی چہیتی کہلائی اس کا جوڑ ادتی کے لال قلعہ میں قطع ہوا ہوگا۔ ہونا تو یہی چاہئے تھا مگر ایسا ہوا نہیں! بلکہ اس کے برخلاف اس کا جامہ دکھن اور وہاں کے معمولی گھر میں تیار ہوا!!

کیا سچ کہا ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے' ان اطراف میں ایک عرصہ تک فارسی عام اور حاکم و محکوم دونوں کے قلم کی زبان بنی رہی اس وجہ سے اظہار مطالب کے لئے کسی اور آلہ کی عرصہ تک ضرورت پیدا نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے دکھن جہاں عوام کی طرح سرکاری دفتر تک کی زبان ملکی ہو چکی تھی۔ جذبات و خیالات عرصہ تک گھٹ کر رہ نہیں سکتے وہ راہ ڈھونڈ تھے اور کسی نہ کسی شکل میں نکلنا چاہتے ہیں۔ وہاں (دکھن) فارسی مٹ چکی اور ملکی زبان (دکھنی) اسکی جگہ لے چکی تھی۔ اظہار جذبات کی ضرورت جس وقت عام اور ناگزیر ہوئی اسی نے آلہ (دکھنی اردو) وہ ضرورت پوری کی گئی۔ اور اس طرح اس ایجاد نے جنوب کو شمال پر فوقیت و دیگر فضلیت کا تاج دکھن اور دکھنی کے سر پر رکھدیا!!

## اردو کا پہلا جامہ

دکن کی یہ ریاستیں (بیجاپوری' نظام شاہی وغیرہ) ہند سے علیحدگی

خود مختاری کے بعد اپنی وضع و آئین میں کسی کی پابند نہ رہی تھیں اور جبکہ یوسف
عادل شاہ نے مملکت بیجاپور قائم کی تو اپنی نذر کے مطابق خطبہ میں آئمۂ اہلبیت کے
مقدس ناموں کو بھی شریک کیا اور انہیں پاک حضرات کے توسل کو اپنا ذریعہ نجات
سمجھتا رہا جب سے اس سلطنت اور پھر نظام شاہیوں اور بعد کو قطب[1] شاہیوں میں
مجالس میلاد و مجالس عزا کا دستور[2] ہو گیا!

ان مجالس میں عموماً پرانی ملکی زبان اور فارسی شعراء کا کلام اور خصوصاً محتشم کے
ہند و مراثی پڑھے جاتے تھے مگر وہ اب دونوں زبانیں متروک ہو چکی تھیں اور دکھن
اپنی زبان کا متلاشی تھا۔ یہ ضرورت پوری ہوئی اور بہت جلد اس نئی زبان (دکھنی)
کے مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس کا سالار و سرتاج شجاع[3] الدین نوری نکلا
یہ وہی نوری ہے جس نے آپ کی زبان کو روشن و منور کیا اور یہی وہ پہلا
خیاط ہے جس نے وہ جامہ قطع کیا جو آپ کی اردو کے قد موزوں پر درست و چست نظر
آیا اور اس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی بنا اخلاق[4] پر ہے اور اس اردو کی زبان

---

[1] گولکنڈہ میں ابراہیم قطب شاہ کا لنگر خانہ و امام بارہ عرصہ تک مشہور رہا [2] اس عزا و غم کا چرچا
اس نرم و گداز ملک میں خلجیوں اور تغلقوں ہی کے وقت سے ہے اور ایرانیوں اور تورانیوں کے ساتھ
ہندیوں نے مل کر اس فکر کو کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ قائم اور اپنی ملکی ٹھیٹھ زبانوں میں اس نوحہ و ماتم کو جاری رکھا
جس کے آثار اب تک باقی ہیں عادل شاہی اس کے موجد نہیں انہوں نے اس پرانی رسم کو باضابطہ کر کے تازہ کر دیا
اور بس! [3] شجاع الدین احمد آبادی نہیں بلکہ اصل بیجاپوری تھا۔ مرزا جان (اکبری) جو کہ خود ایک
بڑا شاعر و ادیب تھا۔ نوری کی قدر کرنے لگا اور جب اکبر کے حکم سے وہ گجرات کی طرف گیا تو نوری بھی
ساتھ تھا اور احمد آباد میں عرصہ تک رہا (دیکھو تاریخ فتح گجرات از ملا میر کابلی قلمی) انسائیکلوپیڈیا میں
نوری کو ہمعصر فیضی لکھا ہے۔ یہ سچ ہے مگر ان کا احمد آبادی ہونا غلط قائم و کمال نے بھی اپنے تذکرہ
میں تتبع کیا اور گارسن دی تاسی (فرنچ) بھی اسے بھولا نہیں ہے مگر اس کا کلام کسی نے نقل نہیں کیا۔ [4]
سوا اردو کے کسی زبان کی بنیاد اخلاق پر نہیں پڑی اور جملہ موجودہ زبانوں پر اسی سے اس کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے

پھوٹتی ہے تو اس ذکر میں جس ذکر نے عالم میں ایک صحیح و سادہ اخلاق پھیلایا اور ہمیشہ پھیلاتا رہے گا۔ موجودہ زبانوں میں سوا اردو کے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں کہ اس کے نظم و نثر کی بنیاد کسی اخلاق پر رکھی گئی ہو۔ نظم کا حال تو معلوم ہو چکا اب نثر کا قصہ آگے آتا ہے

ابراہیم عادل شاہ کے وقت تک یہ ذکر عام ہو چکا تھا اور ظہوری نے جہاں اس (ابراہیم) کی نورس پر ایک جید تقریظ (نثر) لکھی وہاں ضرورت سے مجبور ہو کر مرثیہ کہنے بھی بیٹھ گیا۔ اور پھر اس رواج نے اتنا زور پکڑا کہ ہاشم علیؔ برہان پوری نے تو اس کے لئے اپنے کو وقف کر ہی دیا۔ یہ شخص آپ کی اردو نظم بلکہ اخلاقی نظم کا وہ دوسرا لائق تجدید بانی ہے جس کی محنت شکر ہے کہ رائیگاں نہیں گئی اور ایڈن برا (اسکوٹ لینڈ) یونیورسٹی کی مشہور لائبریری میں اس کے کلام (مراثی) کا ایک اچھا حصہ ابتک موجود محفوظ ہے!!

پرانی تحقیقات کی بموجب چونکہ دکنی نظم اردو کا باوا آدم تسلیم کر لیا گیا ہے

---

لہ ہاشم علی برہان پوری تھا اور اسکی نشو و نما نظام شاہیوں اور عادل شاہیوں کے وقت میں ہوئی اور زیادہ تر جہانگیر کا ہے اس نے زیادہ تر مرثیے ہی لکھے اور اسی میں نام نکالا۔ ایک قطعہ مرثیہ کا ملاحظہ ہو۔

مرثیہ

کوئی نہ تھا بیگانہ از بندہ و خطا — ظلم تھا سب خویش و سب اقوام کا
ختم ہے یو امتحان و ویلا — ختم ہے جو حق ستیں پیغام کا
تھا برا اولاد شفیع المذنبین — ظلم بیحد در جہان اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اوپر — گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا
زہر دے مارے حسن کوں کر ستیں — سبز تھا وہ چہرۂ گلفام کا
کربلا میں تھا حسین ابن علیؔ — آج لگ ہے گا انہیں ایام کا

(دیکھو مراثی ہاشم علی در ایڈن برا یونیورسٹی لبرری)

اس لئے یہ بھی یقین کر لیا گیا ہے کہ غزلوں سے اس زبان کی ابتدا ہوئی اور پھر سمجھ لیا گیا کہ محض گل و بلبل سے اسکی آشنائی رہی اور اس وجہ سے ہماری اردو کا دائرہ تنگ نظروں میں ہمیشہ تنگ ہی نظر آیا۔ تلاش و تحقیقات کے دروازے بند نہیں ہیں۔ اور آپ نے ذرا توجہ کی تو سرچ اس زبان کے اور بہت سے راز آپ پر کھول دیگی اور اس وقت آپ کو اپنی اردو کی قدامت و سعادت وسعت و ہمہ گیری معلوم ہو سکیگی!

## دکھنی شاعری اور اس کا زوال

نوری و ہاشم کے بعد دکھن میں دکھنی اور مرثیہ گوئی نے اور ترقی کی)۔ رام راؤ[1] اور سیوا[2] نے جو بعد کو نام نکالا اور پھر کاظم علی[3] نے مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ ادب و

---

[1] رام راؤ قطب شاہی منداُمیر ہے جس نے رامائن کا خلاصہ دکھنی نظم میں کیا۔ اس نے مرثیے بھی کہے (تذکرۂ قاسم) [2] سیوا ایک مشہور دکھنی مرثیہ گو ہے اور اس نے روضۃ الشہدا فارسی میں ۱۰۹۱ھ میں بعہد عالمگیر لکھی قانون اسلام (فارسی) ایک کتاب بھی اسکی مشہور ہے (تذکرۂ تاسی) [3] کاظم علی نوری و ہاشم کے بعد مرثیہ گوئی میں یہ بھی شہرۂ آفاق ہوا۔ اس کے ایک مرثیے کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے نابکاران دیں کا چھتر گرانا کہاں روا
سرور نبی کی آل کون یو دکھ میں لے آنا کہاں روا

رکھنا امام دیں کے تئیں جنگل میں بے آب و نان
طفلاں کو انکے بے گنہ غم میں رلانا کہاں روا

جن کو بٹھاتے تھے نبی دوش مبارک پر مدام
نیزہ پر انکے سر کے تئیں رکھکر پھرانا کہاں روا

وہ اصغر معصوم کوں سرور حسینؑ کے ہاتھ پر
پیکاں کے آب ہر سوں شربت پلانا کہاں روا

کاظم کے مراثی بھی ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود و محفوظ ہیں یہ اشعار وہیں سے نقل کئے گئے۔ کاظم کی جنگ سہراب و رستم والی فتوی کا انگریزی میں بھی مسٹر آبٹ کنس نے ترجمہ کیا (دیکھو تاسی)

وانشاء کا شوق اتنا بڑھا کہ دلّی و لکھنؤ کی طرح گھر گھر شاعر[1] پیدا ہونے لگے خود (وہاں کے) شاہوں نے دکھنی کو سرفراز کیا اور سلطان قطب[2] شاہ (ہمعصر شاہجہاں) نے اس میں غزلیں تک کہیں اور اخیر میں ابوالحسن تانا شاہ[3] نے قیدخانہ میں بیٹھ کر اپنے جذبات نظم ہی کے پیرائے میں نکالے!

آل تیمور کے دانت دکھن پر مدت سے تھے اکبر نے ادھر مہم بھیجی اور پھر خود چڑھا۔ جہانگیر و شاہجہاں کے عہد تک یہ سلسلہ جاری رہا اور عالمگیر نے اس پرانے ارادہ کو تکمیل تک پہنچایا۔ ابوالحسن (تانا شاہ) کے ساتھ ہی ملک دکھن کا عروج بھی جاتا رہا۔ اور سلطنت گردی و زبان گردی ساتھ ساتھ ہو گئی۔ دکھنی شعراء جن کی سلطنت کے دسترخوان پر جگہ تھی بھوکھوں مرنے لگے اور آخر تتر بتر ہو گئے! بعض ان میں کے دلی پہنچے اور بعضوں نے بنگالہ کی راہ اختیار کی اور مرشد آباد پہنچکر مسند نظامت سے جا لگے!

---

[1] دکھنی اردو کے شعرا بے حساب ہیں مگر یہ بہت مشہور ہوئے ایجادی صاحب دیوان اسکی زبان اس وقت کی شاہجہانی اردو سے بہت ملتی ہوئی تھی (تاسی) فتح علی صاحب تذکرہ فتح علی شاہ۔ فضل دکھنی افضل الدین خاں صاحب مثنوی راجہ رام ادائری صاحب پھل بن طوطی نامہ یہ تصنیف سلطان عبداللہ قطب شاہ عہد شاہجہاں کے نام پر معنون ہوئی قطب شاہ دکھنی صاحب مثنوی رسول اکرم یہ ۱۰۸ شہ (زمانہ جہانگیر) میں تصنیف ہوئی۔ دیدار صاحب مثنوی درحالات ماہ منور (سوداگر بچہ ہو) مثنوی شمشاد بانو۔ دختر فرنگ۔ [2] سلطان قطب شاہ والی حیدرآباد ۱۵۰۲ شہ عہد اکبر صاحب دیوان تھا اس کا دیوان کتب خانہ ٹیپو سلطان میں موجود تھا (تاسی) [3] تانا شاہ کا ٹھیٹھ دکھنی میں ایک شعر مشہور چلا آتا ہے جو اس نے قیدخانہ میں کہا ؎

کس رکھوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ بھل بھجراٹے ہے
اس بات کے مونگے سجن یاں دل ہی بارہ باٹ ہے

؎ غم کی سل

یعنی اپنی حالت آخر کہیں تو کس سے کوئی سننے والا نہیں اور پھر غم کی سل چھاتی پر اور دل ڈھیلے کی طرح ٹھوکروں میں مارا مارا پھرتا ہے (دیکھو تذکرہ گلشن ہند از لطف)

# اردو اپنے گھر میں

حق کہا ہے ابن مریم نے کہ پیغمبر ذلیل نہیں ہوتا مگر اپنے گھر میں! یہی حال اس اردو کا دلی میں ہوا۔ ایک عرصہ سے روزمرہ تو یہی تھا مگر وقت پر وہ لاوارث بچہ کی طرح پرے ڈال دی جاتی اور کوئی منہ نہیں لگاتا۔ عالمگیر کے بعد مدت تک یہی بے تعلقی رہی مگر خدا بھلا کرے دکھنیوں اور خصوصاً دکھنی شہزادوں کا کہ جب انہیں بہادر شاہ[1] کے دربار میں جگہ ملی اور شہر میں پھیلے تو انکی بدولت یہاں اردو کے بخت بھی جاگے۔ دکھنی اپنا ادب ساتھ لائے تھے دلی والے اپنے بچہ کو غیروں کی گود میں اس طرح دیکھ کر شرمائے اور پھر متوجہ ہوئے تو حق پدری ادا کرنے لگے اور مرزا عبدالقادر بیدل اور میر جعفر زٹلی[2] (جنہوں نے دکھن کی ہوا بھی کھائی تھی اور اعظم و معظم کے متوسلین میں سے تھے) پرانی صف سے دو قدم آگے بڑھے اور اس طفل سے مخاطب ہوئے

---

[1] سکندر عادل شاہ بیجاپوری و قطب شاہ (گولکنڈہ) کو بہادر شاہ نے اپنوں کی طرح رکھا اور ان کے وجود سے دلی پر بہت اثر پڑا۔ امراء و متوسلین دکھن بھی ان سلطانوں کے ساتھ آئے اور دلی میں انکی ایک چھوٹی سی بستی ہی الگ بس گئی اردو میں پورچوگیز الفاظ انہیں دکھنیوں کے ذریعہ سے آئے وہاں یہ قوم بس چکی تھی اور دکھنی انکی لفظیں قبول کر چکے تھے

[2] بعض تذکروں میں زٹلی کو زٹل کہہ کر اڑا دیا گیا ہے مگر یہ انکی کم بینی ہے اردو کو صرف غزلوں کے اندر محدود سمجھنا نادانی ہے۔ زبان کی وسعت تو کچھ اور چاہ رہی ہے اور یہاں ابتک غزلوں ہی کے کوچے میں پھیرے لگائے جا رہے ہیں! بہرکیف، یہ میر جعفر ہی ہیں جنہوں نے ان اطراف میں زبان کو وسعت دی۔ اردو نظم اور متعدد قطعات کہے۔ عالمگیر کا اردو میں ایک مرثیہ کہا۔ اپنے شہر آشوب میں اسوقت کی حالت اور بھائیوں (اعظم و معظم و بہادر شاہ) کی جنگ کا نقشہ کھینچا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ عالمگیر کو یاد کرکے کہتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۷۴ پر)

لیکن اب تک جو کچھ ہوا وہ فقط وقت گزاری اور دل بہلاؤ تھا۔ اور یہ شرف محمد شاہ ہی کے لئے اٹھا رکھا گیا تھا کہ یہ نونہال اسی کے زیر سایہ پلے اور شاہجہاں کی یادگاریوں میں پھولے اور پھلے!!

## طفل اُردو کا مکتب

بہادر شاہ کے وقت تک اردو کا ریختہ پختہ نہوا تھا مگر جب کہ بیدل[۱] نے

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۳)

کہاں پائے اب ایسا شاہنشاہ      مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
رکت کی آنجھوں جگت ووتا ہے      نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
فلک رقاص بازی آنچناں کرد      زہر کس از خلل نقل مکاں کرد
دوادو ہر طرف بھاجڑ پڑی ہے      جدھر دیکھو تدھر بھاگڑ پڑی ہے
ازاں سو اعظم وزیں سو معظم      زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں را مختصر کن      ز دور مختلف در دل حذر کن

انہوں نے فرخ سیر کی تخت نشینی پر ایک مسخرانہ قطعہ لکھا اور سخت معتوب ہوئے ۱۱۲۵ھ تک جیتے تھے (دیکھو اڈنبرا یونیورسٹی میں زٹل کا سرمایہ) [۱] مرزا عبدالقادر بیدل وہ صاحب کمال ہیں جنکی نظیر دنیا میں جلد نہیں ملتی یہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ مدتوں دکھن میں بھی رہے اور اسوقت کے کل امراء انکا ادب و لحاظ کرتے تھے اور انکی شاگردی کا دم بھرتے تھے آخر میں نظام الملک آصفجاہ کے سے امیر نے بکمال خلوص انہیں دکھن طلب کیا مگر یہ شعر جواب میں عرض کر بھیجا اور خود نہیں گئے ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش      من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

امیر الامرا سید حسین علیخاں کے ساتھ انکے ربط و ضبط کی حکایتیں مشہور عالم ہیں انکے کمال پر نظر کرکے نواب نے ایکمرتبہ تین لاکھ روپئے اُن کے گھر بھجوایا لیکن قناعت کے گھر میں اسکی گنجایش نہ دیکھکر بصد شکریہ واپس کر دیا اور ان اطراف کے باکمالوں میں مرزا وہ پہلے ذی کمال ہیں جنہوں نے اردو کیطرف بھی توجہ کی اور اسے دکھن اور زمانہ کا اثر کہنا چاہیئے فرماتے ہیں ؎ مت پوچھ دل کی باتیں بیدل کہاں ہی ہم ہیں   اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
(مرزا نے ۱۱۳۳ھ میں قضا کی)      جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا   پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

ادھر دل دیا تو وہ اُمرا جو انکی شاگردی کا دم بھرتے تھے اور انہیں بزرگ مانتے تھے اس زبان کو بھی اپنی محفل و مجلس میں جگہ دیکر حق شاگردی ادا کرنے لگے! بے خبر جو چاہیں کہیں مگر اردو بادشاہوں مہاراجوں اور ہمارے امراء کی گودیں پل کر جوان ہوئی اور قلعوں محلوں کی ہوا کھا کر بانکی ہے اور آج بھی انہیں شاہی متوسلین اور پرانے گھروں کے سوا اُس کا صحیح ٹھکانا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

یہ دلی کے امراء ہی تھے کہ جنہوں نے اس چونچال بچہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی توجہ کا شیر پلا پلا کر اُسے پال نکالا ان ہی امراء میں سے فرخ سیر کے زمانہ میں ایک امیر باتدبیر تھا جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک اور عوام محمد امیر خاں کہتی اور انجمن شعرا انجام کے لقب سے یاد کرتی ہے یہ نواب بھی بیدل ہی کا دلدادہ و مقلد تھا اور جس وقت استاد اردو کی طرف مخاطب ہوا تو مودب شاگرد بھی ہمہ تن اُدھر متوجہ ہو گیا! انکی اس توجہ و خیال سے اس زبان کا وہ آوازہ بلند ہوا کہ ساری دلی گونج اٹھی اور پھر تو گھر گھر سے اسی کی صدا آنے لگی۔

نواب عمدۃ الملک[1] جیسا کہ پرانے تذکرے اور تاریخیں شاہد ہیں نہ صرف عربی و فارسی کا ماہر و اُستاد تھا بلکہ اُس کی سنسکرت اور بھاشا دانی کا بھی زمانہ

---

[1] عمدۃ الملک کی یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ مجتہد زبان و فن ہے اور کسی کا مقلد کیسا سب اسی کے شاگرد و زلہ خوار ہیں ؎

کیوں بلایا پھر ہمیں مجھسے یہ نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ، شرم سے پانی ہوئی

گل محیطِ عشق کے صدقوں سے پانی نبی تھا
کشتیٔ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ہر پری تمثال جو آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھکو سخت حیرانی ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ ہو)

قائل تھا ان کے دوہے اور کبت عرصہ تک دلی کے گلی کوچوں میں پڑھے اور گائے جاتے رہے۔ اردو کی طرف توجہ کی تو نہ صرف خود شاعر بنے بلکہ دنیا کو شاعر بنا چھوڑا اور عالمانہ شوقوں کے ساتھ نواب نے اس زبان کی ترقی کے لئے اپنی نگرانی میں ایک "انجمن" بھی قائم کی جس میں وقت کے فضلاء و زبان دان شریک ہوتے الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑوں و چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں وہ تحقیق شدہ الفاظ و محاورات درج ہوتے اور پھر سارے ہند میں اس کی نقل بھیجدی جاتی اور دیگر امراء اسی امیر کی تقلید کو

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵)

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبت دشمن جانی ہوئی

**دوم**

ٹک تو فرصت دے کہ بولیں خصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغ غلامی سے تری طاؤس وا
سامنے قمری کے گو ہیں سر سال آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر ما نند شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیر خنجر فولاد ہم

افسوس کہ محمد شاہ کے ہاتھ سے نواب کا انجام بخیر نہ ہوا کہتے ہیں کہ شاہی اشارے سے دیوان خاص میں ۱۱۵۹ء شہید کئے گئے ان کے گھر کی ضبطی ہوئی اور دیگر اثاثات البیت کے ساتھ ان کا نادر کتب خانہ بھی برباد ہوا اور یوں ان کا کلام بھی تلف ہو گیا۔

؎ ذرا زبان کو دیکھنا یہ دو سو برس کی اردو ہے۔ میاں ولی کیا کسی ولی نے یہ زبان کی کرامت نہیں دکھائی۔

فخر جانتے اسی دفتر و انجمن میں حاتم و ضاحک[1] بھی تھے جنکی زباندانی کے آخر سکے بیٹھے
اسی دفتر و انجمن کو یاد کر کے میر انیس اردو کو اپنے گھر کی زبان کہتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ ورنہ دلی جب بھی اور انیس کے وقت میں بھی زباندانو سے خالی نہ تھی مگر ہر ایک اس اسکول کا تعلیم یافتہ نہ تھا اور جب دلی کے بعد فیض آباد میں سالار جنگیوں کے شوق نے اس دفتر کو پھر قائم کیا تو ضاحک و میر حسن کو اس سے خاص تعلق رہا اور یہی سبب ہے کہ حسن کے گھر کے سوا اس زبان کا حسن کہیں اور اس طرح جلوہ نہ دے سکا۔

اسی عمدۃ الملکی انجمن کا یہ اثر و آوازہ تھا کہ دلدادگان مذاق و شیفتگان شاعری دور دور سے اس طرف کھنچ آئے اور آخر میاں ولی[2] بھی دکھن سے اپنا دیوان بغل میں دبائے کھوٹے اور کھرے کی شناخت کے لئے اسی ٹکسال گھر سے آلگے!

---

[1] حاتم کا نواب کے یہاں تعلق تو مشہور ہے مگر ضاحک کے تعلق کو بہت کم لوگ جانتے ہیں یہ روایت سینہ بسینہ اور اپنے بزرگوں سے ہم تک پہنچی ہے ضاحک ۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۰ھ میں مرے (دیکھو آسی) اور اس حساب سے وہ محمد شاہ کے عہد میں جوان کیسے ادھیڑ تھے اور عمدۃ الملک کی سرکار میں رہکر پورے زباندان بنے جب نواب کا کارخانہ بگڑا تو سالار جنگیوں اور صفدر جنگیوں نے اسے تھمیٹا اور مدتوں فیض آباد میں یہ زباندانی کا اسکول قائم رہا، ضاحک و میر حسن اور خلیق تک کو ان سرکاروں سے واسطہ رہا۔ انیس کی عمر کا ایک اچھا حصہ ان ہی محل میں (جو زبان کا ٹکسال گھر تھا) گذرا اور اس سے انکی تیغ زبان میں وہ جوہر آشکارا ہوئے جو ان ہی گھرانوں کے سوا اور کہیں دکھائی نہیں دیسکتے ۱۲

[2] ولی سنہ جلوس محمد شاہی میں دلی آئے یعنی جبکہ بیدل مر چکے اور زباندانی و شاعری کا چرچا وہاں عام ہو چکا تھا عمدۃ الملک (شاگرد بیدل) بھی اس وقت جوان اور اپنی زباندانی و شاعری کا سکہ جما چکے تھے۔ تعجب ہے کہ دلی ہی کو اردو کا باوا آدم کہنا اور دکھنی اردو کو ٹکسالی اردو کے بالمقابل سمجھنا کس درجہ کم بینی و کم علمی کی نشانی ہے انجام سو لی کی زبان شاعری ہی کو ملا کر دیکھو تو صاحب مذاق کبھی ولی کو ان پر ترجیح نہیں دیسکتا دلی کے ایک معاصر میاں حیدری مرثیہ گو بھی ہیں اور تعجب سے خالی نہیں ان کا روزمرہ بھی دلی سے کہیں بہتر ہے۔

اس انجمن کا وزن و اعتبار روز بروز بڑھتا چلا اور آخر سلطنت نے بھی اس کا سکہ مانا اور محمد شاہ نے ان ہی محمد امیر خاں کو عمدۃ الملک اور اپنا نائب بنا کر اس اردو کے چلن کو عام گردانا!

## شاہ عالم[۵] اور اردو

دلی کے اجڑنے اور لٹنے پر اردو بھی لٹتی۔ مگر یہ بڑی سخت جان نکلی۔ قلعہ ابھی خالی نہ ہوا تھا اور یہ قلعہ والی سر جھکائے وہاں بیٹھی رہی اپنی حیثیت کے ساتھ شاہ عالم نے اسے بھی سنبھالا اور بزرگوں کی اس نشانی کو سینہ سے لگایا۔ بادشاہ شاعر اور اس زمین کا آفتاب تھا ذرے دامن دولت سے لپٹے اور پھر چمکنے لگے۔ ملکی زبان بڑھنے اور رعایا دعا دینے لگی جب سے تخت اور اسکی کرسی ساتھی بچھی اور

---

۵ شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا۔ غزلوں کے چار دیوان بادشاہ نے چھوڑے۔ غلام قادر کور نمک نقد نظر بھی لوٹ چکا تو بادشاہ نے عجب دردناک مرثیہ کہا کہتے کہتے کہتے ہیں۔

چہ حادثہ برخاست پئے خواری ما | داد برباد سر و برگ جہانداری ما
چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد | کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما
داد افغان بچہ شوکت شاہی برباد | کیست جز ذات خدائے کہ کند یاری ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم | عاقبت گشت بہ جور پئے خواری ما
گل محمد کہ ز مرداں بہ شرارت کم نیست | چہ قدر کرد وکالت بہ گرفتاری ما
ہم الہ یار و سلیمان و بدل بیگ لعین | ہر سہ بستند کمر بہر دل آزاری ما
مادھوجی سینہ چیا فرزند جگر بند من | ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
آصف الدولہ و انگریز کہ دلسوز من اند | چہ عجب کہ بہ نمایند مددگاری ما

آخر وہاں بدبخت بہادر شاہ اور یہاں (لکھنؤ) بدنصیب اختر شاہ[1] تک تخت و کرسی کا یہ جوڑ برابر قائم رہا۔

# نادرُ الوجود اتحاد

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

باغ ہند کی چار ہزار سالہ تاریخ آج پیش نظر ہے اور دو مختلف قوموں کے اتحاد کی حکایت انہیں دو بولوں میں جلوہ گر ہے! آگے تشریح بے مزہ اور ذہن و دماغ پر بار ہو گی۔ خالی اتنا پڑھ لو کہ یہاں کے اصلی باغبانوں نے اپنے چمن کے اس گل کو کس طرح طرۂ دستار بنایا اور اپنی پگڑیوں کو کیونکر اس سے سجایا! لو سنو! احمد شاہ کے عہد سے لیکر نئی سلطنت ۱۷۱۹ء سے ۱۸۵۰ء تک کا یہ نمونہ مگر نمونہ از خروارے ہے)

(۱) آرام۔ پریم ناتھ خوشنویس بھی تھے۔ پُرگو ایسے کہ انتخاب کرنے پر بھی دیوان) دو ہزار شعروں پر ختم ہوا ؎

---

[1] واجد علی شاہ اختر کو ناواقف دنیا تو عجب طرح سے یاد کرتی ہے گر جاننے والے ہی انکی قدر و ثنا کر سکتے ہیں۔ انکے علم فضل اور دماغی قابلیت کو دیکھنا ہو تو ان کے تصانیف کو دیکھو۔ قریب پچاس کتابوں (نظم و نثر) کے لکھ کر ڈال گئے مرثیے اور غزلیں سکے علاوہ ہیں! زبان شاعری کا مذاق اسی سلسلہ سے یہاں تک پہنچا جس سلسلہ میں بہو بیگم اور آصف الدولہ کے زباندان موجود تھے۔ اختر کا ایک مطلع نہیں بھولنا فرماتے ہیں ؎

ایک حسرت طور پر بھی بھسم موسیٰ رہ گئی　　ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی

تورتن کے جواب میں سلطان عالم نے اپنے یہاں سبع سیارہ قائم کیا تھا اور اس سے ان کا مذاق ثابت ہوتا ہے۔ یہ سیارے لکھنؤ سے مٹیا برج کلکتہ تک اپنے اختر کے ساتھ ساتھ رہے اور راجہ گنگا پرشاد کے سے دریائے معانی بھی اسی ہفت رتن کے ایک گوہر نایاب ہیں!

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا　　دل کا فوارہ اچھلتا ہی رہا
کون غمخواری کرے آرام کی　　ایک مجنوں تھا سو جلتا ہی رہا

آرام۔ مکھن لال انشاد سے ان کا بڑا یارانہ تھا ؎

ہمدو مجھ سے یہ کہتے ہو نہ تو یار سے مل　　اسکو سمجھاؤ ذرا یہ کہ نہ اغیار سے مل

اخگر۔ دیوان شک چند۔ مرزا نرم فرزند جہاندار شاہ کے متوسلین میں سے تھے ؎

کون کہتا ہے کہ ہم نے مے پرستی چھوڑ دی　　راتدن پیتے ہیں مے، پر مے پرستی چھوڑ دی

اسد۔ رائے سنگھ ؎

چشم کو حال سے عاشق کے یہ بیہوشی ہے　　دل جو حیراں ہے تو یاں سرمہ خاموشی ہے

امانت۔ امانت رائے۔ ؎

تشریف یاں نہ لاؤ پر نامہ بر تو بھیجو　　مت لو خبر ہماری اپنی خبر تو بھیجو

(ب) برق لالہ بھگوانند ؎

مجھے بھی ہٹ ہوئی ایسی کہ مر مٹا لیکن　　نہ تیرے کوچہ سے ہرگز قدم اٹھا میرا

بسمل۔ منا لال ؎

غیر کے کہنے پہ تم مجھ پہ نہ بیداد کرو　　بندگی برسوں کی اک دم میں برباد کرو

بہادر۔ بہادر سنگھ ہمعصر شاہ حاتم ؎

ملا دلا نظر آتا ہے کچھ گل رخسار　　رہا ہے کس کے گلے کا تو ہار ساری رات

ادھر تو مسکی ہے چولی ادھر کھلے ہیں بند　　نجانے کس نے یہ لوٹی بہار ساری رات

بہار۔ منشی ٹیک چند۔ صاحب بہار عجم مشہور و معروف مصنف

وہی اک رسیماں ہے جسکو ہم تم تار کہتے ہیں　　کہیں تسبیح کا دانہ کہیں زنار کہتے ہیں

**بیتاب** ۔ سنتھوک رائے شاگرد قائم سے

نہ رہے باغ جہاں میں کبھی آرام سے ہم | پھنس گئے قید قفس میں جو چھٹے دام سے ہم
اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریق اخلاص | کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

**بیجان** ۔ شیو سنگھ دہلوی ۱۸۸۰ء میں سرگ باشی ہوئے۔

بیجاں ہیں جان تک بھی دی پر | میرا نہ ہوا وہ شوخ دلبر

**بیخود** ۔ لالہ نرائن داس شاگرد ۔ درد سے

سرشک گرم سے میرے بہا سیلاب آتش کا | بنایا ہے الٰہی کیا دل بیتاب آتش کا

(پ) **پروانہ** ۔ راجہ جسونت سنگھ (خلف مہاراجہ بینی بہادر) نواب شجاع الدولہ (بنگالہ) کے مصاحبین خاص میں سے تھے سے

تڑپتے جو دیکھیں ہیں لاشیں تو دل اب | ترے کوچہ کو کربلا جانتا ہے

(ت) **تسکین** ۔ پنڈت گنگا داس سے

ناصح یہ نصیحت اب تم کرتے ہو کیا بیٹھے | جو ہوئے سو ہو بہتر ۔ دل اس سے لگا بیٹھے
کیا غم ہے ہمیں تسکیں آفات زمانہ سے | اب ہم شہ مرداں کے دامن تلے آ بیٹھے

**تسلی** ۔ ٹیکا رام ۔ ساکن اٹاوہ ۔ شاگرد مصحفی سے

میاں جو کچھ ترے سج دھج میں مزا ئی نکلتی ہے
کہاں مرزا امزا جوں میں یہ رعنائی نکلتی ہے

(ج) **جھمن** ۔ جھمن لال ۔ امیر الامراء ضابطہ خاں کی سرکار سے انہیں توسل تھا بہار دانش کو اردو نظم کا خلعت پہنا گئے سے

دل جو سینہ عشق کی آتش سے جل گیا | اک آہ کھینچتے ہی مرا دم نکل گیا

(ح) حضور۔ لالہ بال مکند۔ شاگرد۔ درد سے

جفا کو تم وفا سمجھے ستم کو ہم کرم سمجھے ادھر کچھ دل میں تم سمجھے ادھر کچھ دل میں ہم سمجھے

(د) دل۔ بینی پرشاد عظیم آبادی سے

پردہ اٹھاکے تو نے ادھر کو گذر کیا عالم کے دل میں تیری محبت نے گھر کیا

دیوانہ۔ سرپ سنگھ۔ غزل گوئی میں استاد تسلیم کئے گئے لطف (گلشن ہند میں) لکھتے ہیں کہ مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران اُن کے تلامذہ میں سے تھے ۱۲۰۱ھ میں قضا کی سوا ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا ہے سے

## رباعی

وہ لوگ کہاں کہ یار باتیں کیجے وہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے

ایک گوشہ میں بیٹھکر دیوانہ تنہا اب ناخن غم سے دل خراشی کیجے

دل۔ دیبی پرشاد۔ مرشد آبادی سے

امید وصل اس سے عبث تو رکھے ہے دل جس سے کہ رسم نامہ و پیغام بھی نہ ہو

دلخوش۔ بہادر سنگھ۔ امرائے محمد شاہی میں سے تھے سے

ہوں ترے ہجر میں جوں دیدۂ نرگس حیراں چشم پوشی نہ کر اپنے گنہگار سے مل

(ذ) ذرہ مرزا راجہ رام ناتھ۔ مصاحب خاص شاہ عالم بادشاہ۔ شاہ عالم کے آفتاب کے سامنے ذرہ بنکر اپنے خلوص و وفاداری کو چمکایا کئے۔ مجالس کے بڑے دلدادہ۔ تعزیہ رکھتے اور محرم میں سبز پوش رہتے تھے۔ اللہ رے اس زمانہ کا ہندو مسلم اتحاد سے

غضب ہے آکے عاشق کو لٹا دیتی ہیں لالا آنکھیں چھپا لیتی ہیں میری جان وہ کافر چھپا لا آنکھیں

ذرہ - لالہ چنی داس - دلی میں ان کا مکتب مشہور تھا - ہندو مسلمان سب ساتھ پڑھتے اور دونوں مل کر فیض اٹھاتے - بڑے خدا رسیدہ اور مرنج و مرنجان تھے۔ سچ کہتے ہیں ؎

کام عاجزوں کے کردو نیکی کے تخم بولو
آب رواں جہاں ہے کچھ ہاتھ اپنے دھولو

ذکا - خوب چندر (دہلوی) ؎

نقش پا خالق حقیقی نے بنایا ہم کو
جس کے قدموں سے لگے اس نے مٹایا ہم کو

(ر) راجہ - راجہ بہادر خلف راجہ شتاب رائے دیوان ناظم بنگالہ وصوبہ دار عظیم آباد پٹنہ ؎

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے
دم ہم تلک نہ پہنچا ہم دم تلک نہ پہنچے

راجہ - راجہ رام پنڈت - ریختی ہمعصر رنگین ؎

جن دنوں تم نے محبت کا دیا تھا پیغام
مجکو معلوم جو ہوتا یہ ستانا صاحب
تو تو میں بخت جلی آئی نہ تم پاس کبھو
خیر اللہ کو یہ بھی تھا دکھانا صاحب

راجہ - بینی بہادر (بنگال) ؎

سیاہی منہ کی گئی دل کی آرزو نہ گئی
ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

رسوا - آفتاب رائے - رسوا محمد شاہ کے سلح خانہ میں نوکر تھے۔

رسوا ہوا - خراب ہوا - دربدر ہوا
اس عاشقی کے پنتھ میں جس کا گذر ہوا
طریقت ۱۲

رنگین - پورن لال دہلوی ؎

رنگیں نہیں ہیں قطرۂ شبنم یہ باغ میں
باد صبا نے مے سے بھرا ہے ایاغ گل

(س) سخنور - لالہ دیوان سنگھ - خلف رائے جے سنگھ ؎

گریاں رکھے ہے بن ترے یہ چشم تر مجھے ‌‌ ‌ طوفان نوح آئے ہے اب پھر نظر مجھے
ہوتی عیاں ہے صورت ہستی و نیستی ‌ ‌ جوں نقش پا ہمیشہ سر رہ گذر مجھے

سرشار۔ لالہ تلوک چند (متقدمین میں سے ہیں) ؎

مارا ہوا اس ابروئے خمدار کا سرشار ‌ ‌ پانی بھی نہ مانگے کبھی وہیں پڑا پھڑکے

(ش) شاد۔ رائے لال سکندرآبادی۔

اس رنگ چنپئی کا پڑا جس زمیں پہ عکس ‌ ‌ چنپا کے پھول اگتے ہیں اس سے بہار میں

شاداب۔ خوش وقت رائے چاندپوری ہمعصر قائم۔

جبتلک ہو کام مژگاں سے تو ابرومت چڑھا ‌ ‌ تیر کے ہوتے کوئی کھینچے بھی ہے تلوار کو

شعلہ۔ پنڈت امرناتھ۔

تھے نہ سیماب ہوس کے نہ طلا زرگر کے ہم ‌ ‌ کیا سمجھ کر چرخ نے مجکو ملایا خاک میں

(ص) صبا کانجھے لال۔ فیروزآبادی۔ صاحب دیوان

چلے دامن اٹھا کے یہ کہو اس شوخ قاتل سے ‌ ‌ کہ یہ مدفن نظر آتا ہے رنگیں خون بسمل سے

(ض) ضمیر۔ گنگا داس

میں بتاتا ہوں ضمیر اب کچھ تجھے بھی ہے خیال ‌ ‌ چشم خواب آلود اسکی فتنۂ بیدار ہے

(ع) عاشق، رام سنگھ کھتری۔

حیرت زدہ میں دیکھوں ہوں جب اسکو بزم میں ‌ ‌ تصویر جیسے دیکھے ہے تصویر کی طرف

عزیز۔ بھاری لال

بات اب امتحاں پہ آئی ہے ‌ ‌ قصہ کوتاہ۔ جاں پہ آئی ہے

عزیز۔ مہاراج سنگھ

ضعف سے ہر رگ تن جسکی ہو تار بستر — کیونکہ بستر سے وہ بیمار اٹھے اور بیٹھے

**عیاش** - خیالی رام۔

جام ہے ہاتھ میں اور شیشۂ مے زیر بغل — نہیں عیاش کو اب بزم خرابات سے چھوٹ

**(غ) غافل** - بختاور سنگھ

بیمار عشق کی نہ دوا ہو طبیب سے — مرجائے یا جیئے کوئی اپنے نصیب سے

**غلام** - راجہ گوپال ناتھ خلف مرزا راجہ رام ناتھ - ذرہ امیر و مقرب شاہ عالم میں سے تھے۔ بادشاہ آفتاب تھے۔ مرزا راجہ ذرہ بنے اور انہوں نے غلام بنکر حق نمک ادا کیا۔

خط دے تو نہ دے گوش بر آواز ہیں قاصد — مژدہ تو ہمیں یار کے آنے کا سُنا دے

**(ف) فارغ** - کمند سنگھ شاگرد - شاہ حاتم

دور سے دیکھ مجھے جیں بہ جبیں ہوتا ہے — تاکہ کچھ کہہ نہ سکوں بل بے رکھائی تیری

**(ق) قلندر** - لالہ بدھ سنگھ (ہمعصر خان آرزو)

جی کو سر زندگی نہیں ہے — کیا جی کے کروں کہ جی نہیں ہے

**(ک) کامل** - پنڈت ٹھاکر داس

پلٹ کر جو دیکھا سر راہ اس نے — لگا تیر اک بازگشتی جگر پر

**(م) مضطر** - کنور سین - انہوں نے واقعہ کربلا کو بھی نظم کیا اور منشی کریم الدین اس کے بڑے معرف ہیں!

خلل انداز و فاکون ساعتاز ہوا — کہ جواب خط مضطر قلم انداز ہوا

سوز جگر کو دیدۂ پُرنم کو دیکھئے — ان آفتوں کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

**مضطرب** ۔ درگا پرشاد ۔

ترے وعدوں پہ اب ہے دم شماری　　بہت اختر شماری کر چکے ہم

**منشی** ۔ مول چند ۔

خواہش نہیں کہ ہاتھ مرے سیم و زر لگے　　یہ آرزو ہے سینہ سے وہ سیم بر لگے

**منعم** ۔ موہن لال

کہیں آیا ہے دلا آج قدِ یار نظر　　کچھ قیامت کے سے آتے ہیں جو آثار نظر

**موزوں** ۔ چھتر سنگھ (بیرۂ منشی مادھو رام صاحب انشائے مادھو رام)

بیت ابرو کو ترے دیکھ کے اے مطلع حسن　　جو ترے کوچہ سے نکلا سو غزل خواں نکلا

(ن) **ناور** ۔ گنگا سنگھ ۔ شاگرد میر حسن

قاصد تو اس بہانہ سے اُس پاس جائیو　　یہ کس کا خط ہے مجھکو ذرا پڑھ سنائیو

**نسیم** ۔ مرزا راجہ کدار ناتھ ۔ نبیرۂ راجہ رام ناتھ سرکار عالم شاہ میں عہدۂ نظارت پر مامور تھے ۔

قتل ہاتھوں سے ترے عاشق رنجور ہوا　　درد سر روز کا تھا ۔ خوب ہوا دور ہوا

**نشاط** ۔ یشور سنگھ خلف سندر داس (ہمعصر انشاد)

ہوا جازت تو ذرا لیجئے دم سایہ میں　　تری دیوار کے آ پہنچے ہیں ہم سایہ میں

**نظیر** ۔ گنپت رائے شاگرد ۔ نصیر

کیا زرد ہوئیں عشق کے آزار سے آنکھیں　　ہم چشم ہیں اب نرگس بیمار سے آنکھیں

# ہندوستانی

(۱) مکتولال لاہوری نے علم بیان میں ایک رسالہ لکھا۔ پھر ایک تذکرہ تالیف کیا۔ گلدستۂ نشاط (انتخاب غزلیات) کے جامع بھی یہی ہیں۔

(۲) ماسٹر رام چندر (خلف رائے سندر لال و نبیرہ رائے ٹیک چند) نے جبر و مقابلہ اصول علم مثلث بالجبر، علم ہندسہ تراشہائے مخروطی حساب و جزئیات و کلیات میں رسائل تالیف کرکے ذخیرۂ اردو کو بڑھایا۔ عجائب روزگار بھی انہیں کی یادگار ہیں۔

(۳) بابو اجودھیا پرشاد نے علم مساحت و قوانین متعلقہ پر رسائل تالیف کئے اور ہر شکل کی ہیئت کو اپنی زبان میں بھی سمجھا گئے!

(۴) بابو ہردیو سنگھ (خلف بابو بسنتی رام) علم پیمائش و اصول حساب کا دفتر اردو میں کھول گئے

(۵) پنڈت رام کشن نے فن ڈاکٹری کی اپنی زبان میں تشریح کی ان کے متعدد علمی رسائل ہیں۔ قانون اسلام و دھرم شاستر کو بھی انہیں نے ایک رشتہ میں منسلک کردیا

(۶) بابو شیو نرائن طبعیات پر ایک رسالہ تالیف کرگئے ان کا ایک جغرافیہ ہند بھی مشہور ہے۔ ڈموستھی نس کی لائف بھی اردو میں بیان کی۔

(۷) بابو موتی لال اس کے بعد سسرد کے حالات زندگی لکھکر چھوڑ گئے

(۸) بابو دھوم نرائن نے تاریخ انگلستان لکھی اور اس زمانہ میں پولٹیکل اکانومی کے مشکل مسائل کو اردو میں بھی سلجھا گئے!

(۹) بابو گوبند سنگھ۔ پرانی دنیا کو نئی دنیا (امریکہ) کی خبر دے گئے۔

# بنگالی

(۱) مہاراج، راج کرشنا بہادر مشہور و معروف مہاراجہ ناواکرشنا بہادر (میر منشی وارن ہیسٹنگز) کے خلف اکبر یہ وہی ناواکرشنا ہیں جن کا ذکر تاریخوں میں آتا ہے۔لارڈ کلایو کے ساتھ بھی رہے اور شاہی دربار تک بھی آخر انکی رسائی ہوئی راج کرشنا اسی نامور باپ کے بیٹے ہیں۔فارسی کے تو خیر ماہر اور مشہور بے بدل منشی تھے ہی۔اس کے ساتھی اردو پر بھی اہل زبان کی طرح قدرت دکھادی منظم شاہ کا حال (نظم اردو) میں لکھا اور ایسا لکھا کہ اسوقت وہ مقبول خاص و عام ہوا۔موسیو گارسن دی تاسی خبر دیتے ہیں کہ انکی یہ نظم ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) اور پیرس کے سرکاری کتب خانہ اور برلن کی یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھی۔انہوں نے غزلیں بے شمار کہیں۔کلیات پانچ جلدوں میں تھا۔اور ان کے فرزند راجہ کالی کرشنا اسے جان سے لگائے رہے۔

(۲) راجہ کالی کرشنا بہادر خلف راج کرشنا بہادر فارسی اردو کا شوق انہوں نے وراثت میں پایا یہ مشہور و معروف خاندان بنگالہ و کلکتہ میں ممتاز رہا اور سودا بزار راج فیمیلی کے نام سے ابتک جیتا ہے۔کالی کرشنا ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔مجموعہ لطائف اردو انہیں کی تالیفات میں سے ہے! گرے کی (انگریزی) کی ایک نظم کو اردو میں نظم کرکے احسن المواعظ اس کا نام رکھا یہ پہلے شاعر ہیں۔جنہوں نے انگریزی خزانہ سے اردو کو بھی فیض پہنچایا ان کا

ایک رسالہ ہئیت میں نظام شمسی کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) راجہ رام موہن رائے بانی فرقہ برہمو سماج اٹھارویں صدی کے مجددین میں سے ہیں (عظیم آباد پٹنہ) میں انہوں نے تعلیم پائی۔ یہ وہی رام موہن رائے ہیں جو آخری شاہ ہند کے ایلچی بنکر اسکی دادرسی کے لئے ولایت گئے۔ اردو میں بھی انکی تصانیف کثرت سے ہیں موسیو گارسن دی تاسی پیرس میں ان سے ملا تھا وہ کہتا ہے کہ راجہ ہم سے اردو میں بھی خط و کتابت کرتے تھے۔ انہوں نے کلکتہ میں ایک اردو اخبار بھی نکالا اور عرصہ تک اس کے ایڈیٹر رہے!

اس داستان اتحاد کے دو اور برگزیدہ ہیرو ہیں جن کے ذکر خیر بغیر ہماری کتاب ختم نہیں ہوسکتی۔ ان میں اول ہمارے مرزا جھنولال طرب ہیں جو کچھ سوچکر اپنا طرب انگیز دیوان گھاگرا کے سپرد کر آئے اور پھر دلگیر بنکر مرثیے کہنے لگے! یہ مرزا جھنولال ہی ہیں جنہوں نے دو قوموں کی زبان کے ساتھ انکی معاشرت و مراسم کو بھی ایک کر دکھایا (حضرت) قاسم کے حال میں (حضرت) کبریٰ کی زبان یوں کھولتے ہیں۔

مجرے کو چچا کے قاسم جب بنرا بنکر آیا ۔۔۔ زینب نے کلیجہ پکڑا دل سرور کا بھر آیا
کبرا رو رو چلائی اب مجھ پر محشر آیا ۔۔۔ بیتابی کی حالت میں یہ حرف زباں پر آیا

قاسم مرنے چلا، چھوڑ مجھے ناشاد
دادی زہرا پہنچے پوتی کی فریاد

اس بنرے نے واں سکو العقبہ بلکتے چھوڑا ۔۔۔ ماں سی بھی جڑا میں آنکھیں دلہن سی بھی منہ موڑا
تلوار کمر میں کسکر اور اپنا ڈپٹ کر گھوڑا ۔۔۔ رو بہ صفتوں کے آگے جوں شیر دلاور آیا

بیسری بولے دیکھو مرنے کو اس آن
سر پر باندھے سہرا آیا ایک جوان

آخر لعینوں نے جوانی ماٹی میں ملائی اسکی
کاٹی پہونچوں سے ہی پہر اک کلائی اسکی

گھوڑے سے گرا اور گھر میں آواز جو آئی اسکی
یوں رو تا لاش پہ اسکی فرزند پیمبر آیا

قاسم دُلہن کو تیرے ٹھور ہو نہ بٹھاؤں
ماٹی میں یوں مل گیو بیر حسن کے ناؤں

گھوڑے پر لاشہ رکھ کر اس زخمی تیغ و سنا کا
خیمہ کی جانب رو رو شبیر نے گھوڑا ہانکا

سوہے چولے سے اُسدم بنڑی نے منھ اپنا ڈھانکا
دلہ کا لاشہ جب دم خیمہ کے اندر آیا

ہاتھ کی چوڑی پھوڑ کے نوچے اپنے کیس
منھ کو دھور لپیٹ کے کیا فقیری بھیس

یہ سوہا چولا اور چوڑی عربی نہیں مہندی ہے اور عرب کی خوزادیاں بیوہ ہونے پر وہ نہیں کرتیں۔ جیسے مرزا یہاں دکھا گئے مگر اب ہمارے اعلیٰ گھروں کا یہی دستور ہے اور ایسے سمجھ کر ہم نے اس کو قبول کر لیا اور دلگیر کے قائم کردہ اتحاد کو مان لیا!

ہمارا دوسرا ہیرو اور جوان صالح پنڈت شنکر دیال نسیم ہے! جس کے گلزار میں بھی ہوائے اتحاد یوں ہی چلا کی۔ سنو وہ کیا کہتا ہے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زبان سے اکثر
حمد حق و مدحت پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنے کہ مطیع پنجتن ہے

ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زباں کی پیش دستی

نسیم نے جب یہ حمد و نعت لکھی تو اس کا یہ ہنر ہر ملا کو بھایا اور پیغمبر کی مدح اور پنجتن کی یوں اطاعت پر کسی پنڈت نے اُسے مسلمان نہیں سمجھا اور ایسے آشوب زمانہ اور پُر از نکبت وقت میں چکبست نے بھی اُسے ترک نہ جانا۔ یہ ہندوؤں کا وہ اتحاد ہے جسکی نظیر اس ہند سے باہر تم نہیں پا سکتے۔ مگر یہ وہی اتحاد ہے جسے آج نئی تعلیم نے توڑا اور نئے دماغوں نے جس کا سر کچلا ہے۔

# انگریز اور اُردو

کہا گیا ہے کہ وَلِکُلِّ قَومٍ وَقتٍ! اور ہر قوم کے لئے ایک وقت ہے! اور جب ہمارا وقت بھی پورا ہو چکا تو اس باغ کی باسبانی کے لئے قدرت نے اِس دَور کی بہترین قوم کو چنا۔ یہ قوم تختِ کیان کی آرزو میں نہیں بلکہ تختِ طاؤس کی ہوس میں ادھر آئی اور بہت جلد گھُل ملکر اور بے تکلف ہو کر اس گلزار کی سیر کرنے لگی۔!

انگریز گھاٹ گھاٹ کا پانی پیکر ادھر آئے اور دنیا کا تجربہ رکھتے تھے۔ زبان کی وہ دقتیں جو ان سے قبل کے سیاحوں کو پیش آئی تھیں وہ ان کے رستہ میں بھی حائل ہوئیں۔ لیکن صدیوں سے ایک نظام قائم اور درست ہو چکا تھا۔ سمجھ کر انھوں نے اسی کو ہاتھ میں لیا اور یوں اپنے جہانداروں کو خوش کرنے اور پرچانے لگے! یہ باغ قدرت نے انہیں بخشا تھا اور اس کے اس بڑے عطیہ کا لحاظ کرکے اسکی خدمت پر مستعد ہو گئے! جب سب طرف سے نچنت ہو کر بیٹھے تو اپنے قیام اور اپنی قوم کے یہاں کے استحکام کی سبیل پر غور کرنے لگے۔ سوچنے والے

دماغوں نے سب سے پہلے اسی زبان کے مسئلہ کو سلجھانا چاہا جس کے حل ہوئے بغیر دو مختلف قومیں کبھی ایک اور دوست نہیں بن سکتیں!

اس فرزانہ قوم نے دیکھا کہ یہاں کی اصلی اور سرکاری زبان میں ابتک فرق اور مغائرت ہے۔ اسے اندیشہ ناک تصور کیا اور خوب سمجھا کہ جبکہ اس زمین پر کئی ہزار برس کی ریاضت پر بھی سنسکرت کا درخت جڑ پکڑ نہ سکا اور پھر صدیوں کی محنت پر بھی پالی کے پھول پھل نہ سکے تو پھر فارسی کبتک خزاں سے محفوظ رکھی جاسکتی ہے؟ اس لئے وہ اس زمین کی اصلی پیداوار (زبان) کی آبیاری کو اپنا فرض اور اس باغ کی بہترین خدمت سمجھنے لگے۔!

## فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء

قلعۂ معلیٰ کے بعد فورٹ ولیم اردو کا گھر اور عمدۃ الملکی اسکول کا نمونہ بنا برٹش گورنمنٹ مغلوں کی جائز نائب تھی جس طرح اگلی سلطنت نے اپنی رعایا کا خیال کرکے آخر انہیں انکی زبان عطا کی۔ اس گورنمنٹ نے بھی اسی طرح رعایا پروری کی مثال قائم کی سرکاری حکم وخرچ سے فورٹ ولیم (کلکتہ) میں اردو کالج قائم ہوا اور ڈاکٹر جون گلگرسٹ کی نگرانی میں اس کا نام وکام چل نکلا۔ بکرماجیت و جہانگیر (اکبر) کے سنگاسن میں نورتن جڑے تھے مگر اس نئے تخت میں گیارہ رتن لگے اور جگمگائے۔ سید محمد بخش حیدری۔ میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، بابو نہال چند نہال، میرامن، حفیظ الدین، شیر علی افسوس، کاظم حسین، جواں مظہر علی ولا، اکرام علی اور لالو لال کوی کے سے منتخب جواہر اکٹھا کئے گئے اور سلطنت کے اقبال اور ان

گیارہ یاروں کی مدد سے اردو پھر پننپے اور سنورنے لگی۔

صدیوں کے اتحاد کا زور یہاں اور بڑھا جوان نے شکنتلا (ناٹک) اور بکرما جیت کا حال لکھکر ملکی ہیروز کو زندہ کیا پھر دستور ہندی کی ترتیب سے یہاں کے رسموں کو جگایا اور بارہ ماسا میں اس باغ کے موسموں اور فصلوں کو بتایا۔ ولا نے بیتال پچیسی اور سنگاسن بتیسی کی دلچسپ کہانیاں سنائیں اور قصہ مادھولال کو اپنی زبان میں ہرایا سری لال کو ہی نے پرانی بھاشا کے ذخیرہ کو اپنی نئی بھاشا (اردو) کے خزانہ میں جگہ دی۔ پریم ساگر سنانے اور لطائف ہندی کے پھول کھلانے لگے! پھر راج نیتی میں کشن جی کا جنم پترا کھولکر اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی مستفیض کرنے لگے یہاں چند خوش خوش دوڑے اور گل بکاؤلی توڑلائے اور اردو دانوں کی آنکھیں بھی کھولدیں! انیس اپنے وقت میں اسی سبقت پر اشارہ کرتے اور رشک کھاکر بے اختیار کہتے ہیں ؎

ہر چند سنا گیا ہے اس کو — اردو کی زباں میں سخن گو
وہ نثر ہے داد نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں

یہ تھا اتحاد زبان اور اتحاد خیال اس عہد کا جسے اس سلطنت نے بھی فروغ دیا اور ڈاکٹر گلگرسٹ کے ساتھ کپتان ابراہیم لوکٹ اور فیسر ٹیلر نے بھی جس میں زور لگایا اور دلی کا حال (اردو) بنگالہ لیجا کر وہاں کے بزاروں میں اس طرح عام کردیا گیا!

## سرکاری زبان

دلی کی سلطنت مٹنے پر کسے معلوم تھا کہ اردو پھر یوں راج رچے گی،

اس نئی قوم نے واقعی امید سے زیادہ اور ہمارے حوصلوں سے بڑھکر ملکی زبان کو بڑھایا ایک فورٹ ولیم کالج ہی پر قناعت اور بس نہیں کی گئی بلکہ اس زبان کی وسعت و ہمہ گیری پر نظر کرکے اسے سلطنت کی زبان بنانے اور شاہی اختیارات دینے کی فکر ہونے لگی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز میں یہ مسئلہ پیش ہوکر اس کے ممبروں کو اپنی طرف مخاطب کرنے لگا۔ سرکار کمپنی کے ایک فاضل و زباں داں ممبر مسٹر ام کریو نے اس زبان کے متعلق اس وقت اپنی یہ رائے ظاہر کی!

"مسلمانوں کے قبضۂ ہندوستان سے قبل یہاں کا جو حال ہو مگر اب تو یہاں کی زبانوں کی حالت یہ ہے کہ نہ تو ان کا ماخذ صرف سنسکرت ہی کہی جاسکتی ہے اور نہ وہ زبان صرف ان کی اصل ہے۔ جو دیوناگری میں لکھی جاتی ہے اور یہی حالت ان حروف کی ہے جس میں یہ زبانیں لکھی پڑھی جاتی ہیں! اردو کی اسوقت یہاں کی حالت بجنسہٖ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصۂ ملک سے دوسرے حصۂ ملک تک بے تکلف آ و جا و کسی معاون اور ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی! یہ اردو، عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور فارسی خط میں بہ نسبت دیوناگری کے اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے"! (دیکھو مراسلات صدر بورڈ آف ریونیو اور تجویزات مسٹر ام۔ کریو۔ صفحہ ۸ اخیر کالم)

یہ تھیں وہ صاف اور بے لاگ رائیں جنہوں نے سرکار کمپنی کے خیالات کو اور مضبوط کیا۔ اور آخر ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتر کی زبان اردو قرار پائی اور رعایا کے دلوں سے دعائیں نکلیں!!

# مزید کوشش و ترقی

**دلی کی اردو سوسائٹی** سرکاری توجہ و مہربانی سے ادھر بنگالہ کلکتہ میں اس زبان کا زور قائم ہو لیا تو اب اسی خیال نے اس زبان کے اصلی گھر کو یاد کیا اور ۱۸۴۱ء میں ڈاکٹر اسپرنگر کی زیر نگرانی دلی میں ایک اردو سوسائٹی بنائی گئی اور غدر تک یہ محکمہ قائم اور اردو کو بڑھاتا اور ملک کو فائدہ پہنچاتا رہا۔ منشی کریم الدین پانی پتی کے ساتھ پنڈت رام کشن پنڈت اجودھیا پرشاد، موتی لال، دھرم نرائن، شیو نرائن، تارا رام برہمن اور ہردیو سنگھ و رام چندر نے اپنی زبان کی خدمت کی اور ترجموں اور تالیفات و تصنیفات سے اردو کا خزانہ بھرتے رہے!!

اس وقت ممالک متحدہ میں بھی غیرت باقی تھی اور مسٹر ریڈ کی توجہ سے قمرالدین، چرونجی لال، بنسی دھر، سری لال اور موہن لال نے اپنی اردو کو فروغ دینے میں جانیں لڑائیں اور ہمارے مخدوم مالوی جی کے جنم لینے سے بہت قبل یعنی ۱۸۵۱ء تک آپ کے صوبہ میں بھی اس اردو کا بول بالا اور ہندو مسلم اتحاد کا پرچم چمکتا اور سرکاری التفات بدستور قائم رہا!!

# سائنٹیفک سوسائٹی

ملکی زبان کی طرف مخاطبت اور ہمارے حکام کی اتنی جد و جہد کا نتیجہ یہ تھا کہ دو مختلف قوموں کی مغائرت اس سبیل سے دور کیجائے۔ انہوں نے اس ملک کی تاریخ پڑھی۔ اگلی سلطنتوں کی دقتوں کو جان چکے اور خوب سمجھتے تھے کہ زمین

کسی غیر زبان کے بیج کو قبول کرنے والی نہیں۔ اور پھر تیس کروڑ مخلوق کو اپنی زبان (انگریزی) سکھانے سے زیادہ آسان ہلہل یہ ہے کہ ہم خود انکی زبان سیکھیں اور اور اسے قابو میں کرکے رعایا کے مطالب سمجھیں اور پوری دادرسی کرسکیں اور یوں حاکم و محکوم کا رشتۂ اتحاد ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جائے! سرسید جو ایسے اتحاد کے دل سے حامی اور ہندوستان کے لئے اُسے ایک نعمت سمجھتے تھے اس مقصد کی انجام کی خاطر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور راجہ جے کشن داس کی اعانت سے غازی پور و علیگڈھ میں انہوں نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ یہ اکیڈیمی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی اور مسٹر ولیمس کمشنر میرٹھ اور مسٹر برلی کلکٹر ضلع کی ہمدردیوں اور امداد کی بدولت تین چار برس کے اندر اندر اتنی ترقی کر گئی کہ اس وقت کے کل زباندان اور علم دوست انگریز اس کے شریک ہوئے اور آخر ڈیوک آف آرگائل (وزیر ہند) بھی اسکی طرف مخاطب ہو کر سوسائٹی کے پیٹرن بنے! لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ پنجاب نے اسکی حمایت و امداد کی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے توجہ و سرگرمی دکھائی۔! تصنیف و تالیف کا رستہ کھلا اردو میں انگریزی سائنس اور علوم و فنون کے ترجمے شروع ہو گئے۔ منشی ذکاء اللہ اسسٹر پیارے لال اور پنڈت دھرم نرائن کے سے بزرگوں کے انہماک نے ملکی زبان کو مغربی علوم کے چشموں سے بھی سیراب کرنا اور اس پودے کو بڑھانا شروع کر دیا!

اس سوسائٹی کا مقصد محض تصنیف و تالیف ہی نہ تھا بلکہ اس نے اس ملک کے مرض کی اصلی دوا اور ہمارے درد کا صحیح درماں بھی ڈھونڈ نکالا! زمینداران ضلع علیگڈھ تعلیم کی طرف متوجہ کئے گئے اور انکی منظوری سے سوسائٹی نے ۱۸۶۷ء میں

تعلیمی ٹیکس کے اجرا کا رزولیوشن پاس کرکے اپنی عرضداشت گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں بھیجی۔

اس تیس چالیس برس کے اندر ملکی زبان سے حکام اتنے واقف ہوچکے تھے کہ ہمارے لٹریچر کو سمجھ سکیں اور اس سمجھ کی وجہ سے وہ ہمارے تمدن و معاشرت سے نابلد نہیں رہے تھے۔ زبان کی واقفیت حاکم و محکوم کے رشتۂ اتحاد کو مضبوط کر رہی اور ہماری انکی دوستی مستحکم ہو چلی اور وہ ہماری ضروریات کو بہ آسانی سمجھکر ہمارے ہمدرد ہو رہے تھے! اور انہیں اسباب کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کہ ایسی درخواست حسب قاعدہ مسٹر ہنری لارنس کلکٹر (ضلع علیگڈھ) پاس آئی تو انہوں نے اسکی حمایت کی اور اپنی پرزور رائے کے ساتھ اس گزارش کو گورنمنٹ تک پہنچایا اور آخر حضور وائسرائے نے بھی اس کے جواب میں اپنی خوشنودی ظاہر فرمائی!!

اس سوسائٹی کے کارکنوں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ ایک صحیح مقصد کی طرف آگے بڑھے اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کو اپنا ہم آواز بنا کر اس ملک کی اصلی ضرورت کی طرف گورنمنٹ کو انہوں نے متوجہ کیا۔ اسی سن میں پھر ایک درخواست سرکار میں گئی جس میں اور گزارشوں کے ساتھ یہ دو دفعات بھی تھے!!

اول یہ کہ یہاں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں دیسی زبان میں تعلیم دی جاسکے! اور دوسرے یہ کہ ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے اور ایک جدا یونیورسٹی ملکی زبان میں علیحدہ کھڑی کی جائے!

اب اس کے بعد کیا ہم کو اپنے اصلی ضروریات اور یہاں کے تعلیمی مسائل کو

پھر اور بار بار کہنے اور اس کے سلجھانے کی ضرورت ہے؟ ملک سے واقف اور ہمارے ضروریات سے آشنا نیرنگوں نے آج سے پچاس برس قبل ہماری نکبت کو سمجھا اور اس کے دور کرنے کی فکر کی! یہ وہی طریقۂ تعلیم ہے جس کے اجرا کے بغیر یہ ملک کبھی آگے بڑھ نہیں سکتا اور اسی پر نظر کرکے ایک یورپین کلرجی نے ہمارے فاضل بجنوری (ڈاکٹر عبدالرحمٰن) کو ٹوک کر کہا تھا کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کئے بغیر مسیح کی قسم تم ہزار برس میں بھی ترقی نہیں کر سکتے!

## رنگ میں بھنگ

حق کہا ہے امیرالمومنین نے کہ ان الزمان مفرق الاحباب آخر اسی ناہنجار زمانہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بھائی چارے میں بھی خلل و افتراق ڈالا! یہ اردو جو اُن دو قوموں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ اور یہ زبان جو انکے اتحاد کا بڑا سبب تھی، تفرقہ پردازوں نے اُسے کمزور کرنا چاہا! صدیوں سے آپس میں ایک بے نظیر سمجھوتا ہو چکا تھا اور دونوں اس پر کاربند تھے مسلمانوں نے محبت و خلوص کے برقرار رکھنے اور دوستی کے قائم رہنے کی آرزو میں ایثار کی انتہا کر دی۔ اپنی اصلی زبان عربی، فارسی، ترکی کو ہمیشہ کے لئے انہوں نے بھلایا اور ملکی اپنے عزیز بھائیوں کی زبان کو بے تکلف یاد کر لیا! ہندوؤں نے اس کا لاجواب جواب دیا۔ اور آپس کی کشش کے قائم و دائم رہنے اور جذبات سرد نہ ہو جانے کی خاطر بلا پس و پیش انہوں نے اپنے اُن بھائیوں کے وہ حروف اختیار کر لئے جو سامی عہد کے یادگار اور ایک قدیم قوم کو ایک دوسری پرانی

قوم سے ملانے والے اور دونوں کو ایک ہی صف و سطر پر کھڑا کرکے دنیا کو یکجہتی کا سبق دے رہے تھے۔!

یہ حروف نہ صرف مختصر نویسی[۱] کا ایک اعلیٰ نمونہ اور فن تحریر کے ارتقاء و ایوولیوشن کی جامع و مختصر تاریخ اور پٹ مین کے معلم وہادی ہی تھے بلکہ تاریخ زبان اردو کے وہ بےمثل مفسر و شارح بھی تھے کہ بیک نظر ان کل الفاظ کو معہ انکی پوری شکل و شمائل اور صحیح آواز و معنی اور حسب و درست لب ولہجہ کے عیاں و ظاہر کر سکیں جن کی آمیزش سے یہ زبان صدیوں کی کدوکاوش کے بعد آج شرفاء و نجباء کے منہ تک آنے کے قابل و لائق بنی اور اپنے گذشتہ کارنامے آپ بتا رہی ہے! ہندیوں نے جب ٹوڈرمل کی اسکیم کا استقبال کیا اور فارسی کو اپنا آلہ زبان بنایا اس وقت یہاں ایک نہیں دس طرح کے حروف رائج اور ایک دوسرے سے مختلف تھے ان نئے حروف نے پرانے حروف کی فضول تفریق کو مٹا کر سب کو ایک بنایا اور پھر ایسی سرپرستی قائم کردی کہ بکھرا ہوا ملک ایک ہی سر رشتہ کے تحت میں آگیا اور جب ملکی زبان اردو اختیار کی گئی تو دونوں جماعتوں نے ملکر ان ہی حروف کو سراہا اور اسکو آگے بڑھا دیا۔

ہمارے اگلے بزرگ فارسی ان نئے حرفوں کے صدیوں سے عادی ہو رہے تھے اور بقول ہمارے مخدوم بابو نرندر ناتھ لا کے ان کا طریقۂ تعلیم (اکبر کے وقت میں) یہ تھا کہ بچوں کو پہلے (فارسی) حروف تہجی سکھائے جاتے اس میں آٹھ دن سے زیادہ نہ لگتا۔ املا سکھانے پڑھانے میں دوسرے آٹھ روز صرف ہوتے ہے

[۱] پیٹمین شورٹ ہینڈ (مختصر نویسی) کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

پھر جملے اور اخلاقی فقرات بتائے جاتے اور ایک ماہ کی اندر اندر اس غیر زبان کو لڑکا خود سب پڑھ لیتا (دیکھو پریموشن آف ٹرننگ صفحہ ۱۶۱) اور اس طرح انکی دقتیں سہل ہو چکی تھیں اس کے علاوہ واقعی ایک پراگندہ جماعت اور منتشر ملک کو اس آسان سبیل سے ایک اور متحد کر دینا چاہتے تھے اور جبکہ وہ ملکی زبان کے مالک و ماہر بنے تو اُس زبان کے ساتھ ان ہی حروف کو بھی قائم کر گئے جو انکی تاریخ بتاتے اور اتنے بڑے اتحاد کو برقرار رکھنے والے تھے۔

ان دو قوموں کے ساتھ اب ایک تیسری قوم بھی ہماری شریک و ہم سبق ہو چکی تھی اور ان انگریزوں کی ملک دانی ہوشیاری اور فیاضیوں نے اس اردو کے زور کو بڑھا کر مغائرت کو گھٹایا اور انہیں بھی ہم سے قریب تر کر دیا تھا۔ ملکی زبان جاننے اور اس آلہ سے رعایا کا دل اکر مین کر لینے سے ہمارے اتحاد کی بے نظیر مثال قائم ہو رہی اور اس سے اُن نئے مسافرین کا یہاں گھر بن رہا اور حاکم خوش محکوم بشاش یہ زمین گلزار اور یہ باغ تر و تازہ نظر آ رہا تھا کہ دفعتاً ایک باد مخالف ایسی چلی کہ اسکی بہار آخر خزاں ہو کر رہی!

لارڈ میکالے کے مشہور ڈسپیچ نے ہماری قدیم زبانوں پر ایرا دکیا اور ملک میں ایک نئی قسم کی تعلیم و تربیت جاری کرنے کے لئے انگریزی کے سوا اور کوئی رستہ سجھائی نہ دیا! ہم میکالے کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کرتے ہم اُن کے مزاج اور انکے مشہور تلون سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور اکثر پہلو پر نظر کر کے واقعی ہم ان کے مشکور بھی ہیں۔ مگر انکی زباندانی اور اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان سے انکی واقفیت پر رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتے

خیراسی ڈیسپیچ اور رائے نے خیالات پلٹے۔ انگریزی ابھری اور ملکی زبان (اردو) ڈوبنا شروع ہوئی! اور اس ستر برس میں جو کچھ نتیجہ ظاہر ہوا وہ آئینہ اور تعلیمی اسٹے ٹسٹیک کے صفحوں پر آپ عیاں ہے! اور جبکہ انڈین فیور میں صرف کونین اور ہندی معدوں کے لئے جبکہ خالی پیپن تجویز کر دیجائے تو ایسے معالجین کا کیا علاج!!

اس ناقص اور ہمارے مزاجوں سے مختلف دوا کے اثر کو ابھی ایک پشت بھی نہ گذری تھی کہ معدوں کی تبخیر دماغوں تک چڑھی۔ انتشار شروع ہوا۔ بزرگوں کے قائم کردہ دب قاعدوں کو توڑا گیا اور گھر ہی کے اندر نشار پھیلا گیا اور افسوس کہ امیرالامرا سید حسین علیخاں کی جاگیر اور مہاراجہ شتاب رائے کی زمین ایسی نشارگاہ بنی! اور پھر افسوس کہ زمین ہند اور تاریخ ہند میں بہار اور بہاریوں کے نام پر ایسا دھبہ لگ گیا اور ان کے دامن پر اس خون کا داغ پڑ گیا۔

ابھی آپ نے فورٹ ولیم کالج کا حال پڑھا اور دلی اردو سوسائٹی اور سائنٹیفک سوسائٹی کی روداد پڑھی اور ان دو قوموں کی متفقہ کوشش کے نتیجہ کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔ مگر شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ الہ آباد کے نیچے ہمیشہ سے الٹی گنگا بہتی ہے! ایک طرف تو اتفاق و اتحاد کا وہ زور اور یہاں گنگا جمنا کے سنگم پاس افتراق و دوئی کا وہ شور مچایا جائے کہ ترینی پھاند کر وہ آزاد یورپ اور نگھدیس کو بھی ناس کر دے!

اسی زمانہ میں جبکہ علیگڈھ سنٹیفک سوسائٹی اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن ملک کی اصلی ضرورت دکھا کر اس فیاض گورنمنٹ سے ایک اردو یونیورسٹی مانگ رہی تھیں اور قریب تھا کہ یہ نعمت عطا ہو کر ۳۵ کروڑ مخلوق کی تعلیمی ضرورت

بہت کم خرچ اور کم مدت میں پوری ہو کر انہیں انسان بنا دے کہ ابھی اکبر کے الہ باس اور خدا بخشے بابو سروا پرشاد سنڈیال کے گھر سے مخالفت کا ایک طوفان اٹھا جو یورپ پر چھاتا ہوا خلیج بنگالہ کے کنارے جا لگا! یہ اسی طوفان کا زہریلا اثر تھا کہ ۱۸۷۲ء میں بنگال بہار کے چند نئے تعلیم یافتوں کی کوششوں سے وہاں کی گورنمنٹ میں فارسی حروف یعنی اردو کے اٹھا اور مٹا دینے کی درخواست پیش ہوئی۔ پورے چھ برس سمجھ دار حکام نے اسکی طرف کوئی التفات نہ کی مگر آخر

ع شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت!

مشہور بکلڈانل صاحب کا قدم مبارک بہار کی نرم اور پولی زمین پر جا اور انکی توجہ و برکت سے گڑے مردے اکھڑے اور اس داخل دفتر عرضداشت کے حروف زندہ کئے گئے اور آخر ۱۸۸۰ء میں سر ایشلی ایڈن کے نادری حکم نے وہاں سے اردو کو شہید کر کے بہار اور بہاریوں کو ہزار برس پیچھے ڈھکیل دیا!!

اس حکم پر ایک غلغلہ اٹھا اور تہلکہ مچ گیا۔ اس کے خلاف عرضیوں پر عرضیاں اور میموریل پر میموریل بھیجے گئے۔ مگر راج ہٹ کے آگے سب رویاں اور ٹوئلٹ پیپر نکلے۔ لندن میں اس نئے انصاف کے خلاف آوازیں بلند اور کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ مرحوم لارڈ اسٹینلی آف ایڈرلی نے ایوان پارلیمنٹ کو اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ہلا ڈالا اور وزیر ہند پر جواب پر جواب طلب ہوتے رہے اردو سائنٹیفک سوسائٹی کے پیٹرن ڈیوک آف آرگائل کے جانشین لارڈ نورتھ بروک بوکھلائے اور گھبرائے۔ اور آخر دیکھے سر ول میں ارشاد ہوا تو یہ کہ تبدیلی بہاریوں کے فوائد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اور اس سے انہیں سرکاری دفاتر کی کارروائی اور

اپنے مقدمات کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی!

یہ پیاری منطق اگر صحیح تسلیم کر لی جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ بھولی بھالی رعایا دفتروں کی کوٹھریوں تک جاکر بند ہو جاتی اور آگے نہیں بڑھتی ہے یا اگر کسی طرح چھوٹ کر ججوں اور کلکٹروں کے اجلاس تک پہنچ گئی تو انکی خاطر سے اسوقت ان ہی کی بولیوں اور انہیں کے لفظوں میں بحثیں ہوتیں اور فیصلے لکھے جاتے ہیں تاکہ پیاری رعایا بغیر کسی کی مدد و معاونت کے اپنی قسمت کا فیصلہ خود سن اور سمجھ سکے۔!!

اس تبدیلی نے اسوقت کی بہار گورنمنٹ کی نظر میں جو فائدہ پہنچایا ہو اسکے دیکھنے کے لئے افسوس ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں اور افسوس امریکن ایڈیسن بھی پاس نہیں جس سے ہم کوئی ایسا آلہ بنواسکیں جس کے ذریعہ سے فوائد کے وہ ذرات چمکتے ہوئے نظر آجاسکیں جوان نکڑ آنکھوں سے ابتک سجھائی نہ دے سکے!

ہم نے تو یہی پڑھا اور یہی دیکھا کہ تعلیم یافتہ اور دماغی سوذہنی تربیت پائی ہوئی جماعت کی تقلید و شاگردی ہمیشہ غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ گروہ نے کی اور ان سے کرائی گئی ہے اور اس میں کسی ملک کی بہتری سمجھی اور سمجھائی گئی ہے لیکن یہ عجیب واردات اور اس ملک کی تاریخ میں جلی حرفوں سے لکھ رکھنے کی بات ہے۔ کہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۲ء تک ایک اعلیٰ طبقہ اپنے سے کم اور ادنیٰ درجہ والوں کی غلامی پر اس طرح معذور و مجبور کر دیا گیا ہو اور سچ یوں ہے کہ دماغی و ذہنی ترقی کی جس طرح بہار میں توہین و تذلیل کیگئی اسکی مثال دنیا کی تاریخ اور صفحۂ روزگار پر ڈھونڈھے نہیں مل سکتی!

لیکن اس نئی امت نے اس پرانی زمین (بہار) پر جو ہل چلا دیا ہو۔ مگر امیرالامراء کے یاد رکھنے والے اور شتاب رائے کی عزت کرنے والے اس اتحاد کو مرتے دم تک نہ بھولے جو اس اردو اور اس کے فارسی حروف کی بدولت ایک عرصہ سے اس ملک میں قائم ہو چکا اور جس کے سایہ کے نیچے یہ دو قومیں گردنوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے مزے سے سو رہی تھیں۔ مرحوم مہاراجہ دربھنگہ رائے سکھ راج بہادر، رام کشن پانڈے۔ اور رائے ماتا دین کے سے خاندانی بزرگوں نے اپنی زبان اور اپنے حروف کسی حال نہ چھوڑے اور ہزار سال کے ہندو مسلم اتحاد کو آخر تک نباہے چلے گئے! اور آج بھی وہاں کے خاندانی بزرگوار اپنی اگلی روش پر سلامت اور اپنی پرانی یگانگت پر ثابت قدم ہیں اور اسی قدیم بہار میں آج بھی اولڈہم صاحب (کمشنر پٹنہ) کا سا شخص موجود ہے جس کی زبان اور جس کا قلم ایک طرح چلا، لیکن لغزش نہ کھائی اور وہ وہاں پرانے شریف انگریزا اور ان نجیب سویلینوں کے مبارک عہد کو یاد دلا رہے ہیں جن کی ملت و محبت اور ہماری زبان سے آشنا ہونیکی بدولت ہمارا یہ باغ سرسبز و شاداب دکھائی دیا۔

اس رنگ میں بھنگ اور اپنے ہزار سالا اتحاد کے یوں پامال ہو جانیکی روداد جب میں نے ایک فرنچ مورخ کی زبان سے سنی تو سچ کہتا ہوں کہ میرا قلب بھر آیا اور آنسو کسی طرح تھم نہ سکے! اُس شیریں زباں نے اس پر جھلا کر جو کچھ کہا اُسے دھراتے تو مجھے شرم آتی ہے۔ مگر اس کا دوسرا چست فقرہ پار ان اسپری اینوراد نیونلی تی (Par Unespirtetriot Nationality) کسی طرح بھولتا نہیں اور ہمارے نئے بڑا سبق آموز ہے!

دوستو۔ یہ اسی نحس سال کی گرہ تھی جو آج تک کٹی نہیں اور اپنی قومیت کے الگ قائم کرنے کا یہ وہ تنگ رستہ تھا جو اب تک کشادہ نہ ہوسکا۔ اور جب کہ اسی یادگار سن ۱۸۸۰ کے کچھ ہی بعد انڈین نیشنل کانگرس کا یہاں وجود ہوا تو ایک اچھے اور بڑے طبقہ کو یہ شکایت کرکے اس سے الگ تھلگ رہنے کا موقع مل گیا کہ جنہوں نے صدیوں کے ساتھ کے بعد عین رستہ میں ہمیں اکیلا اور تنہا چھوڑ کر اپنی دوسری راہ نکالی ہو انکی رفتار پر اب آگے کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے یہ ہے ہمارے زوال و پامالی کی تاریخ جسے اُس منحوس سن سے پہلے نہیں بلکہ بعد کو تلاش کرنا اور عینک لگاکر اچھی طرح دیکھنا چاہئے۔!!

حکام وقت کی اتنی بڑی چوک اور دو قوموں کے اس طرح ٹکرا جانے سے وہ شعلۂ فساد نکلا اور بلند ہوا کہ اگر وکٹوریہ کی سی مہربان ملکہ اپنے اخلاق و کرم کے آب سرد سے فوراً اسے نہ بجھا دیتی تو سن ستاون کا غدر پھر تازہ ہو کر ملک میں آگ لگا دیتا۔ یہ ہماری پیاری ملکہ ہی تھی جس نے اپنی رعایا کا خیال کرکے اُسی زمانے میں خود اس اردو کو سیکھا اور یوں اُن کے زخم جگر پر مرہم رکھا اور دلی کے دیوان خاص کے بعد ایوان بکنگھم میں پھر اس زبان کا طوطی بولنے اور چہکنے لگا اور یہ اسی نغمہ کا اثر تھا کہ اس مہارانی کا پوتا اور ہمارا موجودہ شاہنشاہ جب یہاں قیصر ہند بننے تشریف لایا تو دلی شہر میں اپنی جاں نثار سپاہ سے اُسی ملکی زبان اور شاہجہانی اردو میں مخاطب ہوا اور یہ وہی شاہی اثر ہے کہ اب بھی لیڈی چمسفورڈ رعایائے ہند کو اپنی موجودہ ملکہ کا محبت بھرا پیغام اسی رانی جودہ بائی کی زبان میں سنانے کھڑی ہوتی اور اس طرح ہمارے دلوں کو

موہ لیتی ہیں !!

یہ چار ہزار برس کی داستان جو کومیڈی اور ٹریجیڈی دونوں کا مرقع تھی آپ کے سامنے پیش کردی گئی۔ اب چلتے چلتے مقدس و برگزیدہ بودھ کی زبان سے اتنا اور سن لو کہ دھرم کرو، دھرم کرو، اردو کا سنکھ پھونکو اور اردو کی ڈنڈ مچاؤ اور بس !!!

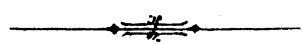

# غیر آریا و آریا ہند میں

عجائباتِ عالم میں سے عجیب تر اس کا وہ حصۂ ارضی ہے جسے ہم آریا ورت[1] یا ملک ہند کہتے ہیں! اس زمین کی ہمیشہ سے یہ شان رہی کہ اُس کا کوئی خطہ کسی ایک قوم اور کسی ایک نسل سے کبھی بھرا پُرا نظر نہ آیا۔ سارے جہاں کی نیرنگی و رنگینی اسی ایک باغ کے اندر سمٹ کر چلی آئی دور دراز زمینوں کے بیج لا لا کر یہاں ڈالے گئے اور سات سمندر پار کے تازہ قلم یہاں لگائے گئے۔ بھانت بھانت کا جانور اس وحشی خانہ[2] و رمنہ میں بولا اور چہکا۔ اُن کے زمزموں نے دنیا کے کان کھڑے کر دیئے اور انکی آوازوں پر بے چین دل اِدھر متوجہ ہو گئے

---

[1] آریا ورت = آریہ معنی بزرگ و رت مسکن یعنے آریوں کا گھر۔ آریا ورت ہندوستان کے شمالی حصہ کو پنجاب سے لیکر مگھ دیس (موجودہ بہار) تک کہتے تھے۔ پھر بنگالہ فتح ہو کر اس میں ملا۔ اور اٹک (انڈس) سے برہم پترا (مشرقی دریا) تک سب ایک ہو کر آریا ورت ہو گیا۔

[2] وحشی خانہ = وہ جگہ جہاں قسم قسم کے جانور رکھے جاتے ہیں۔ اسے رمنہ اور (انگریزی میں) زُو بھی کہتے ہیں۔

اس باغ کی اسی روش نے اُسے ایسا سدا بہار بنا دیا کہ بیرونی دنیا آج تک اُس پر مٹی ہوئی اور یہاں کی خاک سرمہ کش دیدۂ شوق بنی ہوی ہے!!

باغ ہند چمنستان عالم کا ایک نمونہ[1] ہے۔ مگر کھلتا نہیں کہ اول کس آدم نے اس زمین پر قدم رکھا، جس کی برکت سے ہندوستان جنت نشان مانا گیا؟ یہ بہت بعد کی حکایتیں ہیں کہ اس ارض پاک کی عالمگیر شہرت نے دنیا کو اسطرف کھینچا اور یہاں کی خاک پر اُن کے سروں کو جھکوا دیا!

اُن خوش نصیب اقوام میں سے اوّل اول جن قوموں نے اِدھر آجانے کا شرف حاصل کیا وہ تین مختلف نسلوں کی یادگار تھیں۔ جو یہاں کے تین مشہور دروازوں سے اندر داخل ہوئیں۔

**اوّل** تبتی برمی (Tiblus-Burman) شمال و مشرق سے ہمالیہ[2] کی سفید برفستانی چوٹیاں پھاندتے ہوئے اِدھر آئے اور اب بھی اُس کے دامن میں پھیلے ہوئے اور ہماری مشرقی حد سے بھی کچھ آگے نکل گئے ہیں۔

**دوم**۔ کولاری (Kolarians) یہ پُوربی کونہ سے اِدھر آئے اسی لیک پر چلے۔ بنگالہ پہونچے اور پھر (مشرقی) دکھن کی طرف اُتر گئے۔

**سوم**۔ دَرَوِیدی (Dravidians) انہوں نے شمال و مغرب (باب الہند) سے سرنکالا، پنجاب میں ڈیرہ ڈالا اور بعد کو کنار سمندر کی ہوا کھاتے، کراتے (مغربی) دکھن پہونچے اور آخر اس کی انتہا یعنی راس کماری

---

[1] دنیا نے تسلیم کرلیا ہے کہ اس عالم میں الگ الگ جو کچھ ہے وہ سب اس سیع زمین میں موجود ہے۔ [2] ہمالیہ سنسکرت میں برف کے ڈھیر (توڑے) کو کہتے ہیں۔

(کیپ کومرن) تک پھیل گئے۔

یہ قومیں یہاں کے دیسیوں[1] ( Aborgines ) سے ملیں اور پھر اُن پر کچھ اس طرح چھائیں کہ دیسیوں اور پردیسیوں کی پہچان نہ رہی اور آخر اُن کل قوموں کا ایک ہی نام، یعنی غیر آریا پڑ گیا۔ اور وہ آجتک اسی نام سے مشہور ہیں۔

غیر آریا زبان۔ زبانیں انسان کے اور حرکات وسکنات کی طرح خود بخود پیدا ہوئی ہیں۔ اندرونی تحریکوں سے اُبھر کر[2] منہ سے کچھ نکل جانا فطرت ہے اور اسی کچھ نکل جانے، کا نام بولی ہے۔ اس فطرت کو پراکرت[3] کہتے ہیں اس لئے ایسی بولیوں کو بھی پراکرت، یعنی فطری بات کہنے لگے۔

پراکرت انسان کا جوہر ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کے فطرت نے یہاں کے دیسیوں یا اُن غیر آریوں کو ایسی نعمت سے محروم رکھا ہو۔ نہ ایسا ہوا اور نہ ایسا ہو سکتا تھا۔

غیر آریا انسان بھی نطق سے خالی اور اظہار مطالب سے عاری نہ تھا۔ وہ مسافر جب اِدھر آیا تو اپنی پراکرت کا توشہ[4] بھی ساتھ لایا۔ جسے یہاں کے دیسیوں کے آگے بھی رکھا۔ اور انکی جھولیوں سے جو کچھ نکلا وہ اُن پردیسیوں کے نذر ہوا اور اس طرح دونوں کا پیٹ بھرتا اور کام چلتا رہا۔

---

[1] دیسی۔ اس عام لفظ کو ہم نے خاص معنوں (یعنی یہاں کے اصلی وقدیم باشندے) میں لیا ہے [2] اُبھرنا ہندی ہے۔ یعنی سخت مجبور ہو کر۔ پیٹ کا اُپھرنا، پھولنا وہ حالت کہ اگر فوراً اس کا دفیعہ نہ ہو تو ہلاکت ہے [3] پراکرت = نیچرل۔ فطری (فوربس' ہندوستانی ڈکشنری)

[4] مسافر گھر سے کھانے، پینے اور دیگر ضروریات کی جو چیزیں لیکر نکلتا ہے اسے توشہ کہتے ہیں۔

جن ایام جاہلیت کا یہ ذکر ہے اس وقت کی دنیا ہی اور تھی۔ ایک اس زمین کا نہیں سارے جہاں کا یہی نقشہ تھا کہ جس جرگے اور جس خیل کو جہاں جو جگہ بھا گئی اتر پڑے اور ڈیرے ڈالدیئے اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا کر رہنے لگے۔ اس تقسیم نے انہیں توڑ دیا۔ اور پھر انکی زبانوں کے بھی ٹکڑے ہوگئے اور آخر ایک بولی سے رنگا رنگ بولیاں پیدا ہوکر یہ باغ اچھا خاصہ وحش خانہ بنگیا یہی بولیاں اُن کی بھاکھا[1] کہلائیں اور یہاں عشق پیچہ[2] کیطرح چھائیں آریوں کی سی زبردست قوم اور انکی دیوبانی[3] زبان (سنسکرت) بھی ان بیلوں کو چھانٹ نہ سکی وہ اس زمین پر پھیلتی، جڑ پکڑتی اور قسم قسم کے پھول پھوند کے سہارے چڑھتی اور پھولتی پھلتی رہیں۔

غیر آریوں کا تمدن۔ یہ زمین ایک مدت تک اُن غیر آریوں کا گھر بنی رہی۔ ممکن نہیں کہ اپنی آسایش کے رستے انہوں نے نکالے نہ ہوں۔ مگر زمانہ اور حکمراں قوم (آریا) کی سختیوں نے اُن کے تمدن کے آثار مٹا ڈالے۔ پھر بھی جو کچھ ظاہر ہوسکے وہ اُن کی انسانیت ثابت کرتے ہیں۔

آریا غیر تھے۔ اس پر انہوں نے ان کی نسبت جو کچھ کہا اُس سے بھی انکی وحشت نہیں بلکہ آدمیت ظاہر ہوتی ہے وہ مقابلہ کے نہ ہوتے تو آریا کی سی قوم اپنے دیوتاؤں کی مدد سے ان پر فتح پانے کا اشارہ نہ کرتی۔ ویدکے

---

[1] اُن کی بھاکھا (بولی) کو شروع میں پہاڑی، کولاری اور تمتی وغیرہ کا لقب دیا گیا۔ مگر زمانہ کے ساتھ نام اور ان بھاکھا کے حالات بھی بدلتے رہے [2] عشق پیچہ (پیچاں) وہ بیل جو پیچ در پیچ ہوتی اور جلد مرجھاتی نہیں [3] دیوبانی = زبان الٰہی، کلام ربانی۔

منتر ہیں کہ :-

ہم اس زمین پر اپنے دیوتاؤں کی مدد سے بیٹھے۔ اور ان کی بدولت ناک
والوں نے اُن ہنکوں کو پچھاڑا ! (میکس مُلر)

پھر اپنے اُن دشمنوں (دس یُو) اور غلاموں (داسا) کو زیر کر لینے کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ اور دیوتاؤں کا بھجن یوں گایا جاتا ہے۔

وہ تو ہی ہے جس نے اُن بیریوں (غیر آریا) کو مارا۔ اور آریوں کو
لالوں لال[2] کیا اور کالوں کو گوروں کا غلام بنا دیا ! (میکس مُلر)

ان کو نام بھی رکھا جاتا ہے کہ

وہ ایک ملیچھ اور نکٹی قوم ہے اور ہم ناک والے ہیں۔ (میکس مُلر)

پھر ان کے مُردوں تک کی ہنسی اڑائی جاتی ہے کہ

انہیں طرح طرح کے کپڑے اور قسم قسم کے گہنے پہنا کر سونپتے[3] ہیں۔
جن سے وہ دنیا کو پھر بسا سکیں گے ! (میکس مُلر)

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر آریا نرے وحشی نہ تھے اور اسی وجہ سے گو باہر والے انہیں زیر کرتے اور اجاڑتے رہے۔ لیکن ان کا بیج نہ مار سکے۔ شمالی ہند (آریوں کا مسکن) میں بھی وہ زمین گیر رہے اور آخر آریوں کو

---

[1] آریا۔ اونچی ناک والے، اور غیر آریا زیادہ تر چپٹے ناک نقشے کے تھے۔

[2] لالوں لال ۔ اس میں اپنے رنگ و روپ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ گورے چٹے اور سرخ و سپید تھے۔

[3] ۔غیر آریا اپنے مُردوں کو جلاتے نہیں گاڑتے تھے

بھی انہیں مان[1] لینا پڑا۔

ان میں کے جو ذرا کمزور تھے وہ البتہ بھاگے اور زیادہ تر دکھن کے جنگلوں اور پہاڑیوں[2] میں جا گھسے۔ بعض دل چلے آگے نکل کر اپنی دوسری غیر آریا جماعت سے جا ملے اور اپنی الگ بستی بسا کر اُن جنگلوں میں ایسا شیر بنے کہ (راجہ) رام چندر جی کے سامنے کھڑے ہو سکے اور رامائن کی سی تصنیف کا ایک اچھا حصہ ادھر کے کارناموں کے نذر ہو کر اُن بہادروں کے نام سے معنون ہو گیا۔ غیر آریا کبھی نہیں مٹے۔ نہ محض آریوں کا بیان بلکہ اور روایات و آثار بھی ان غیر آریوں کی مضبوطی کے شاہد ہیں۔ اور ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی حملوں کا اثر کبھی اُن پر نہیں پڑا کہ وہ نابود ہو جاتے۔

آریا بہ یکدفعہ اور کسی بڑی جمعیت کے ساتھ ادھر نہیں آئے بلکہ گروہ گروہ ہو کر بڑھے۔ ایک جماعت گھر سے چلی، پنجاب کے اُدھر ٹھہری، اس کی دیکھا دیکھی دوسرا قافلہ کھڑا ہوا۔ وہ بھی پہونچا۔ مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو ریلا اور ڈھکیلا۔ اس طرح یہ آریہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچے۔ ان میں خوب پھوٹ تھی۔ ملتے تو غیر آریوں سے بھڑتے۔ ادھر کا زور بھی کم نہ تھا اس لئے برسوں کی دھینگا مشتی[3] کے بعد وہ گرے، مگر زمین پکڑے رہے۔

---

[1] غیر آریوں کی اکثر ریاستیں آریوں کے عروج تک قایم رہیں (ویبر مشہور جرمن محقق) [2] جو ارطرح بھاگے وہ پھر تمدن کے رستہ پر نہ آسکے۔ مدراس کے مُنڈ اور اڑیسہ کے جو آنگ پٹیوے۔ وندھیاچل کے شمالی بھیل، گونڈ، ہینڈا۔ مالابار کے پولئے وغیرہ وغیرہ یہ سب نکالے اور بھاگے ہوئے غیر آریا ہیں۔

[3] آریوں اور غیر آریوں کی کسی باضابطہ لڑائی (سوا راون کے اور وہ بھی دکھن میں) کا ثبوت نہیں ملتا اس لئے اس مڈبھیڑ کو دھینگا مشتی سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

غیر آریا بدی بھی سخت اور پولی مٹی کی نہیں بلکہ بجری اور خوب کٹی پٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانہ سے اس زمین پر اپنا گھر بنائے ہوئے تھے انکی گڑھیاں[1] اور قلعے آریا چھاتیوں پر پہاڑ تھے اور ایسا تھے کہ بھجنوں میں یاد کئے گئے اور انکے گرنے پر دیوتاؤں کے آگے منت کے پھول چڑھائے گئے۔ اس پر بھی انکی بڑائی منائی گئی۔ مگر والمیکی نہ رہ سکا۔ وہ راماین میں ایک موقعہ پر ان کی مضبوطی کی داستان چھیڑتا اور آریوں کی جنگ میں ان کے ایک پہلوان کا رجز یوں سناتا ہے

ہم ایک نڈر قوم ہیں۔ نیلے بادلوں[2] کے سے (زمین پر) پہاڑ ہیں
لڑائیوں میں آندھی ہیں اور ہم ہٹنے والے اور پیٹھ[3] دکھانے والو نہیں
نہیں ہیں! (بہتر مشہور مورخ)

یہی مضبوطی اور قومی سختی تھی جو انہیں جلائے اور ہمیشہ ملائے رہی اور اسی کی بدولت وہ اس زمین پر آج بھی کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ہستی سے اس زمین نے فائدہ اٹھایا۔ اور نہ صرف یہاں کی پیداوار اور دیگر اسباب[4] زندگی ہی

---

[1] ویدوں میں غیر آریوں کی متعدد گڑھیوں اور نوے قلعوں کا ذکر آیا ہے۔

[2] نیلے بادلوں میں اپنے رنگ و روپ اور ڈیل ڈول کو بتایا ہے۔ رام لیلا میں بھی دشمن کی فوج کے سپاہی اسی سج دھج سے لائے جاتے ہیں۔

[3] آں من باشم کہ روزے جنگ بینی پشت من۔ ہند و فارس کی زبان و خیالات میں کس درجہ اتحاد ہے۔

[4] کل حرفے اور پیشے عموماً غیر آریوں کے ہاتھ رہے۔

اُن کے زیر بارِ احسان رہے، بلکہ ملک کی آبادی بھی زیادہ انہیں کی شکرگزار رہے جو غیر آریا بستیوں اور آبادیوں میں رہ گئے وہ آریوں کے تحت و تصرف میں آئے اور اس تصرف نے فطرت کے مطابق اُن میں وہ تعلقات بھی قائم کردیئے جس سے توالد و تناسل میں نمایاں ترقی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ حکمراں قوم (آریا) کے تشدد پر بھی خفیہ اور بہ آہستگی اُن کی حیثیت بڑھتی رہی یہی وہ تدریجی وہ پوشیدہ ترقی تھی جس نے آخر بودھ مت کو اُنکی بنا دیا اور مسلمانوں کے وقت میں[1] وہ شمشیر نکلے اور اب[2] تو چلتے ہوئے پیچھے دکھائی دیتے ہیں ان میں کی خالص و غیر خالص، دونوں جماعتیں ملکر آخر اس ملک کی

---

[1] بودھ کا حال تو سب جانتے ہیں مگر مسلمانوں کے وقت میں ان غیر آریا کا درجہ کس طرح بڑھا اس پر کم نظریں پڑی ہیں۔ آگے کچھ حال ملیگا۔ یہاں اتنا سن لو کہ ہیمو بقال جس نے پٹھانوں کے زمانہ اور سلیم شاہی دور میں وزارت اور عدلی شاہی میں بادشاہت کی اور پھر اکبر کا مقابلہ کیا، وہ بقول ابوالفضل قوم کا ڈھوسر اور نیچ ذات کا بنیا اور غیر آریا تھا! راجہ (مؤتمن الدولہ عمدۃ الملک) ٹوڈرمل وزیر اک پنجابی کھتری اور معمولی گھر کے آدمی تھے۔ اس سے اتنا سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسلمانوں نے ان بیچارے غیر آریوں اور شودروں کو جو زمانہ سے غلامی میں تھے کس طرح آزاد کرکے اپنے برابر کرلیا۔

[2] انگریزوں نے بھی مسلمانوں کی تقلید کی۔ اسوقت بھی حکومت کے مشیر آریا کم اور غیر آریا زیادہ ہیں اور وہ وقت آلگا ہے کہ شودر برہمن کے برابر ہوجائیں۔

ریڑھ کی ہڈی نہیں طبقۂ اوسط ( Middle class ) ہی کے لوگوں پر کسی ملک کی ترقی و بقا منحصر ہے۔ اور یہ غیر آریا ہی یہاں طبقۂ اوسط میں شمار ہوسکتے ہیں۔ اس ملک کی مردم شماری اس راز کو اور کھول دیتی ہے۔

آریا ( برہمن و رجپوت وغیرہ ) پونے دو کروڑ سے زیادہ نہیں۔ اور خالص ( یعنی ناشائستہ ) غیر آریا، دو کروڑ سے اوپر ہیں۔ اور متمدن[1] غیر آریا ( جسے مخلوط یا ملی ہوئی جماعت Mixed people کہتے ہیں جو گر کے اٹھے اور طبقۂ اوسط میں گنے گئے وہ بارہ[2] کروڑ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

یہ حساب اس جماعت کی مضبوطی کو سمجھا کر انکی آئندہ ترقی کی نسبت بہت کچھ بتا سکے گا!!

غیر آریوں کا مستقبل۔ یہاں کے سوا اور ملکوں کے دیسی یا تو فنا ہو گئے یا بہت بری حالت میں رکھے گئے۔ عرب کے بدوؤں اور ایران کے لروں کی نسبت تو کہا جائے گا کہ ان کے رکھ والے خود وحشی یا نیم وحشی تھے اس لئے وہ

---

[1] ناشائستہ غیر آریوں کو تو پہلے بتایا جا چکا۔ اب سنو کہ مدراس کے بھیلے نائر دکھن کے جیالے مرہٹے، سندھی موٹے بنئے دکھنی بھائیے، کماست مارواڑی، پنجاب کے سورما جاٹ اور شیر دل سکھ، پوربی اہل قلم کائستھ اور بنگلہ دیس کے زبان آور بنگالی بھی متمدن غیر آریا اور مسلمانوں کے بڑھائے ہوئے ہیں۔

[2] یہ تعداد سرکاری علاقہ کی ہے۔ ریاستوں کا شمار نہیں۔ وہاں کی چھ سات کروڑ کی آبادی میں تین حصہ غیر آریا ہیں۔ اس لئے کہ عموماً ریاستیں دکھن کی طرف ہیں اور وہی ان (غیر آریا) شیروں کا بیشہ رہا ہے۔!

حیوان، انسان کیوں کر بن سکتے تھے؟ لیکن موجودہ شائستگی کے مدعی انسان اس معاملہ میں کیا کر چکے! اور کیا کر رہے ہیں؟ وہ دیدنی ہے۔ آسٹریلیا و نیوزلینڈ کے دیسیوں اور مکسکو اور پیرو کے قدیم باشندوں اور شمالی امریکہ کی سرخ قوموں ( Red Indians ) کے ساتھ اس وقت کے مہذب و شائستہ گوروں نے جو سلوک کیا وہ ظاہر ہے! اگر یہاں اوّل گوتم بدھ کے طفیل پھر مسلمانوں کی بدولت اور اب انگریزوں کی توجہ سے ہمارے غیر آریا اور دیسی نہ صرف زندہ ہی رہے بلکہ ان میں کی اکثر جماعتیں اپنی صنف سے بہت آگے نکل گئی ہیں!

اس میں شک نہیں کہ انکی سخت جانی بھی انکی بڑی مددگار رہی لیکن انصافاً یا ضرورتاً مسلمانوں اور انگریزوں نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔ اور گزشتہ واقعات کو پیش نظر رکھکر اور موجودہ حکومت کے رجحان کو دیکھکر حکم لگا دیا جا سکتا ہے کہ غیر آریوں کا مستقبل بہت شاندار ہے

مسلمانوں کی تلقین[1] و تعلیم تو کب کی بند ہو چکی۔ سکھوں کی گرنتھ[2] بھی

---

[1] ہندی اسلامی سلطنت کی طرف سے تو کبھی کوئی باضابطہ مشن قایم نہیں ہوا۔ مگر ان کے مشائخین نے اس فرض کو حسن و مدارا کے ساتھ انجام دیا۔ اور یہاں کے کذات (کجات) کو ذات دار اور اپنا بھائی بنا کر ساتھ کھلایا اور ان کا درجہ بڑھایا۔

[2] بابا نانک (لودھیوں کے وقت میں) نے بھی یہی کیا۔ ان کے بالا (ہندو) اور مردانہ (مسلمان) دو چیلوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۷ پر دیکھئے)

کھلتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے اب مشنری ہی خدائی فوجدار ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ تاریکی دور ہو اور غیر آریا (دیسی) روشنی میں آکر زیادہ صاف و شفاف نظر آنے لگیں۔

اس کے سوا زمانہ خود انہیں بڑھا رہا ہے اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ؟ متمدن ہو کر یہاں کے طبقہ اوسط میں مل رہے اور اس ملک کی ریڑھ کی ہڈی بن رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے متمدن غیر آریا بھائیوں میں جذب ہو جائیں گے تو پھر طاقت کس کے ہاتھ میں ہوگی؟ اور اسی کے ساتھ پھر کس کی اور کونسی زبان تیز رہے گی؟ اس کا سمجھ لینا دشوار نہیں ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) وہ یہاں کی گری ہوئی قوموں کو اٹھانا، دوری کا مٹانا، دو مذہبوں کو ملانا اور اس ملاپ سے ایک نئی زبان (جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو) پیدا کر کے قومیت (نیشنلزم) کی بنیاد قائم کر دینا چاہتے تھے۔ ا ھ

نانک تہہ میں در نہیں ہی گو کس با جیسے چھچھ سے اچھچھ نکس جات ہی یا

کہتے ہیں کہ اے نانک آسمان (تہہ) میں تو در نہیں، یہ نبی اس میں گئے کیوں کر؟ خود جواب دیتے ہیں کہ جیسے عینک (چھچھ) سے نظر (اچھچھ) پار ہو جاتی ہے۔ معراج کے متعلق بابا نانک کا یہ شعر غور کے قابل ہے۔

لہ عیسائی مشنری (جو یورپ کی قوت سے قائم ہیں) بھی یہاں کے جنگلوں میں پھیلے ہوئے غیر آریوں کو بتپسما (اصطباغ) دے دے کر انکی شست و شو کر رہے ہیں۔ ان کا درجہ اور بلند ہوتے ہی وہ پھر دوسرے ہو جائیں گے۔ اور ان کی زبان، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور انگریزی نہیں بلکہ ہندی اور آخر میں (لامحالہ) وہ اردو ہو جائے گی جو اس ملک کے تین چوتھائی باشندوں کی بھاکھا اور زبان ہے!!

آریوں[1] کی آمد۔ یہ غیر آریا ابھی اس باغ کی ہوا ہی کھا رہے اور اسکی بہار ہی دیکھ رہے تھے کہ ادھر وسط ایشیا کے پلیٹیو (سطح مرتفع) سے ایک سورما قوم اُٹھی جو آندھی کی طرح بہت جلد آدھی دنیا پر چھا گئی یہ وہی شیر تھے جو ایک طرف (مغرب) جھپٹے تو ایران[2] یونان، روما، اندلس (اسپین) اور انگلستان کو طمانچے مار کر نکل گئے اور دوسری جانب (مشرق) پلٹے تو چین و ماچین کو دبوچتے ہوئے ہمالیہ کے سر پر تھے۔ وہاں برسوں گونجتے اور پھر انڈس[3] و برہم پتر کے کچھار میں مدتوں ہونکتے رہے!

---

[1] آریا سنسکرت میں بڑے اور مغز کو کہتے ہیں۔ اس زبان کو تدوین کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے یہ معنی انہوں نے خود گڑھے۔ ایک جرمن محقق لفظ آر کے معنی ہل کے بتاتا ہے یعنی وہ ایک کھیتی باڑی کرنے والی قوم تھی۔

[2] ایران تو ان آریوں کے نام ہی سے بنا۔ یونان میں ایتھنس و اسپارٹا کی بنیاد انہوں نے ڈالی، روما کے ہفت کوہ ( The seven Hills ) ایسے اُٹھائے کہ اس سلطنت کا بوجھ سنبھالے رہے۔ اندلس (اسپین) کی چاندی انہیں کے دم سے چمکی اور انگریزوں کی زمین ان ہی کے قدم سے دمکی!

[3] انڈس و برہم پتر ہند کے دو مشہور مغربی و مشرقی دریا ہیں۔ انڈس کا ہندی نام اٹک ہے۔ یونانیوں نے اسے انڈس خطاب دیا اور وہ اب تک بحال ہے۔ برہم پتر یعنی خدا (برہما) کا بیٹا اس دریا کے منہ پر یہ لقب پھبتا بھی ہے۔ اس میں واقعی اس کا بڑا ظہور ہے۔!

آریوں کی آمد۔ آریوں کا اصل ٹھکانا نہیں ملتا۔ مگر سب (پرانے محققین)[1] یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ موجودہ ایران کے ذرا اوپر (اُتر) اور توران کے نیچے آدی نا نام ایک بلند و چورس تختۂ زمین (پلیٹو) تھا اور وہی ان کا جنم بھوم ہے۔ یہ اپنے دیس سے بنجاروں کی طرح نکلے۔ نیا دانا۔ نیا پانی کھاتے پیتے بہت دور چلے آئے۔ یہاں قافلہ کے ٹکڑے ہوئے ایک چھم چلا اور دوسرا پورب کو مڑا۔ اس طرف جس نے منہ کیا وہی ہمارے وہ آریا ہیں جو ٹھیکلے[2] لیتے ہوئے آخر پنجاب (پنج آب) تک آئے اور یہاں دریائی قلعوں میں گھر گئے!

یہ جگہ انہیں بہت بھائی، اپنی بستی بسائی اور کھیتی لگائی۔ انڈس (دریا) بڑا مسافر نواز تھا۔ انہیں جلد اپنا کر لیا۔ یہ بھی اس کے ہو گئے اور دیکھو کس محبت سے اُسے پکارتے ہیں۔ بھجن۔

انڈس! نام آور انڈس! دریا دل انڈس! ہمارے کھیتوں کی بھی
خبر لے اور ان کی پیاس بھی بجھا دے! (میکس مُلر)

---

[1] پرانے محققین اور جرمن مورخین بھی آریوں کا اصل ٹھکانا نہیں بتاتے ویبر (مشہور جرمن محقق) بھی اس راز کو کھول نہ سکا۔ اپنے لیکچروں (۱۸۵۱ء) میں اس مضمون سے گریز کر کے آگے بڑھ آتا اور آریوں کو کوہ کوبھا (علاقہ کابل) میں ڈیرے ڈالے دیکھتا اور پھر پنجاب تک انہیں لے آتا ہے۔ مگر حال کے انگریز اہل تحقیق، آریوں کا گھر آسٹریا (ہنگری) میں بتاتے اور انکی ہندوستان آنیوالی جماعت کو دردانیال سے عبور کرا کے ایشیائے کوچک میں بساتے اور پھر ہندوستان پہونچاتے ہیں! [2] ٹھیکلے لینا۔ بمعنی دم لینا۔ ٹھہرنا موسیقی میں بھی ٹھیکلے لینا تقریباً انہیں معنوں میں ہے۔

وہ کشادہ زمین اور وہ پاٹ دار دریا۔ یہ مدتوں وہاں پڑے رہے اُن کی آسودگی کا چرچا پھیلا۔ جس نے ان کے دوسرے بھائیوں کو بھی اِدھر کھینچا۔ زمین جھگڑے کا گھر اور بھائیوں کا بگاڑ آدم کی خو ہے۔ بنتی کیوں کر؟ خم ٹھکے۔ وہ بڑھے، یہ ہٹے اور دبتے دبتے پوربی حد کے کنارے جا لگے۔

آپس کی جنگ کے ساتھ انہیں یہاں کے اُن غیر آریوں کا سامنا بھی تھا جو قدم قدم پر ان کے سدِراہ ہو رہے تھے۔ کوششوں کے بعد وہ بھی گئے اب رستہ صاف تھا۔ دو دریاؤں (انڈس و برہم پتر) کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس باغ کو سینچنے لگے!

آریا زبان۔ دُنیا کی مُردہ و زندہ زبانیں عموماً تین[1] حلقوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔

(۱) آریا ( Aryans ) اس حلقہ میں سنسکرت، فارسی (قدیم و جدید) یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن و انگریزی وغیرہ زبانیں ہیں۔

(۲) سامی ( Semetic ) اس میں کلدانی، عبرانی اور عربی وغیرہ کا شمار ہے۔

(۳) تورانی ( Turanian ) اس دائرہ کے اندر تاتاری، برمی، سیامی اور پیگو، وغیرہ ہیں۔

---

[1] بعض محققین نے ان زبانوں کو چار حلقوں یا خاندانوں میں تقسیم کر کے آسٹرک کو بڑھایا اور ہندوستان سے اس کے تعلقات بتائے ہیں۔

اس پہلے حلقہ یعنی آریہ پراکرت کی سوغات چار طرف بٹی۔ ایران نے اس تحفہ کو ژند[1] لقب دیا اور ہندوستان نے اس کا نام سانسکرت[2] رکھا۔ یہ ژند و سنسکرت ایک درخت کی شاخیں اور ایک گھر کی بیٹیاں ہیں۔ دونوں کی ایک تاریخ، ایک روایت اور ایک سی حکایت ہے۔ اور اتنی دوری اور ایسی مہجوری کے بعد بھی ایک کو دوسرے کا خیال، اور ایک کا دوسرے پر اثر کبھی نہ مٹا۔ وہاں اسی ژند میں ان (پارسیوں) کی مذہبی کتاب اوستا[3] نازل ہوئی اور یہاں ہماری سنسکرت میں ویدا سی کتاب میں اتری!

ادھر کا قصہ تو ادھر رہا۔ ادھر کی حکایت یہی وید سناتے اور آریوں کی بزرگی کی داستان پڑھتے ہیں۔ اگر صرف مذہب و شاعری ہی کسی قوم کی بڑائی کی سند ہوں تو آریا اس میں بھی کسی قوم سے پیچھے نہ دکھائی دینگے جب عالم میں اندھیرا تھا یہ مخلوق اپنے خالق کو ڈھونڈ لائی اور جب دماغ محدود اور علم مفقود تھے۔ انکی قوت تخیل آسمان پر تھی۔ رگ وید[4] کا زمانہ چار ہزار برس

---

[1] ژند یا ژند۔ یعنی دانستن (سنسکرت میں جَنُد ہے۔ جن، جاننا اسی سے نکلا ہے!) ژند اور ویدی زبان تقریباً ایک ہیں۔ [2] سانسکرت یعنی مکمل سَن = جامع اور کرت ( Kirte ) پورا کرنا۔ لاطینی میں ( Creane ) ہے اسی سے انگریزی میں ( Create ) پیدا ہو گیا۔ [3] ژند اوستا ( Zend Avesta ) پارسیوں کا متبرک کلام جو شاہ یونانی (سن ۳۰۹، ۳۳۸ قبل مسیح) کے وقت میں مدون ہوا۔ [4] رگ وید۔ رگ کے معنی حمد و نعت کے ہیں اور وید معنی علم۔ اسکی پیدائش ۴ ہزار سال قبل مسیح بتائی جاتی ہے (آر سی دت)

قبل مسیح ہے۔ اس وقت کوہ طور بھی اگر بے نور نہ تھا تو دور ضرور تھا۔ مگر ہند کا دماغ روشن و پر نور تھا!

اس رگ وید میں ایک ہزار سے اوپر بھجن اور دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں اور ان نظموں میں دنیا کی باتیں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ایک شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوتا ہے؛ یہاں قوم کی قوم فطری شاعری اور حقیقی جذبات میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنے محسن انڈس کو جس انداز سے انہوں نے پکارا، اسے بھی سن چکے ہو۔ اب دوسرے ناز و نیاز پر نظر کرو۔ بھجن

ابتدا میں کچھ نہ تھا۔ ایک حسین[1] بچہ پیدا ہوا۔ یہ کائنات اسی کی تھی

زمین و آسمان کا بنانیوالا۔ زندگی و قوت کا بخشنے والا

وہی تو ہے!

وہی وجہ موت۔ وہی وجہ حیات۔ ہر طرف چھایا ہو (محیط!)

ابر پر بھی نظر رکھنے والا۔ روشنی اور ہوا کا اندازہ کرنیوالا

وہی تو ہے!

وہی تو ہے جس کے آگے ہم جھکتے اور نیاز چڑھاتے ہیں!

وہی تو ہے!

(میکس مُلر Max Muller)

جس قوم کی یہ آنکھیں ہوں، اس کا ہوش و گوش کیسا ہوگا؟ یہ اسی درک و

---

[1] حسین بچہ = حسنِ اوّل!

فہم کا نتیجہ تھا کہ سب سے اول انہوں نے اپنی زبان کو سدھارا کہ وہ اظہار خیالات کا بہترین آلہ اور تسخیر و تاثیر کا زبردست آرگن ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اسی زور بیان نے انہیں اتنا بڑا بنا دیا۔ اسی سے انکی ابتداء اور اسی پر انکی انتہا ہوئی اور انکی نسبت جو کچھ کہا جائیگا وہ انکی انہیں دو طاقتوں (مذہب و شاعری) کے تحت میں ہوگا۔

ویدی عہد و سنسکرتی دور = آریوں کی زبان کے دو دور ہیں۔ ایک ویدی۔ اور دوسرا سنسکرتی۔ یہ پاکیزہ قوم جب تک (موجودہ[1]) ہندوستان کے ادھر یا پنجاب میں رہی اس کی زبان و خیالات میں وہی تاثیر و سادگی تھی جو فطرت کی کسی محبوب قوم کا خاصہ ہیں۔ اور چونکہ رگ وید کی پیدائش کا یہی زمانہ ہے، اس وجہ سے اس میں یہ خاصیت تمام تر موجود ہے۔ اسے قرن اولی یا ویدی عہد کہتے ہیں۔ مگر یہ وقت دیرپا نہ تھا۔ جیوں جیوں یہ قوم بڑھتی اور متمدن ہوتی گئی، ویدی آمد ختم اور سنسکرتی آورد شروع ہونے لگی۔ اور یہ تعجب خیز نہیں۔ قوموں کی ابتدائی، درمیانی اور انکی اخیر حالت میں فرق لازمی ہے۔ اور یہاں بھی یہی ہوا۔!

اس زمین پر ان (آریوں) کے قدم جم لئے اور وہ مطمئن ہو لئے تو اپنے مذہب کی تدوین[2] اور اپنی زبان کی تدہین[3] پر متوجہ ہوئے اور ان کے تمدن کا

---

[1] اس وقت میں ہندوستان کا نقشہ اور تھا

[2] تدوین = جمع کردن، ترتیب دادن۔

[3] تدہین = چرب نمودن۔

یہ دوسرا دور یعنی سنسکرتی عہد کہلاتا ہے۔ اسی زمانہ میں ان کے علم و فن اور خصوصاً اُن کے مذہب و شاعری کی تکمیل ہوئی۔ آریا علوم و فنون کا تفصیلی بیان ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ضمناً اتنا اشارہ بس ہوگا کہ

یہ قوم اکثر فنون میں دُنیا کی اُستاد ہے (علم) نجوم میں ڈوبی تو آفتاب بنکر چمکی۔ یونانیوں کو (سنہ ۳۲۷ قبل مسیح) نور اور عربوں کو (سنہ ۸۷۰ء) روشنی اور یورپ کو ضیا یہیں سے ملی!

اس علم (نجوم) کا ستارا یہاں کبھی نہیں ڈوبا۔ مغلئی دور میں محمد شاہ کا زمانہ گردش کا زمانہ ہے۔ مگر اُن ایام میں بھی اُجالا رہا۔ راجہ جے سنگھ کا (دلّی میں) رصد خانہ اور محمد شاہی زیچ (زیک جنتر منتر) کا نام ہمیشہ روشن رہے گا، جسے فرانیسی مشہور منجم، دی لا ہائر نے (سنہ ۱۷۰۳ء) اپنی زمین پر بھی چمکایا

انکی ریاضی کا کیا حساب؟ جسکی مشق نے انہیں استادوں میں شمار کرا دیا! موسیقی اصل انہیں کے گلو میں اُتری اور انکے سرگم[1] نے

---

[1] سرگم: ہندی راگ میں سات نئے سُرُں کا اضافہ ہوا۔ اسے سرگم کہتے ہیں۔ یہ سُر فطرت سے اتنا ملے ہوئے ہیں کہ رُوح پر بے اختیار ان کا اثر پڑتا ہے (س، رِ، گ، م، پ، دھ، نِ) عرب اور ایران نے ان سُرُں کی یوں نقل کی (دَ، رِ، مَ، فَ، صَ، لَ، بِ: یعنی دُرِّ مفصل! ایرانیوں اور خصوصاً عربوں کے ذریعہ سے یہ فن یورپ پہونچا اور گیڈو دَ آرِزو وہاں اپنی موسیقی کا راگ اس میں گانے لگا!

فطرت کی آواز سے آواز ملادی! ان کی آیا وید یعنی الہامی
حکمت (طب) نے یونانیوں کو شفا بخشی، عربوں کو قانون دیا اور
یورپ کو بایولجی بخش کر زندہ کردیا۔ چرا کا یہاں کا وہی بید ہے
جو عرصہ تک وہاں کا بقراط بنا رہا!

**آریا ادب۔** ویدوں کے بعد آریونکی وجاہت کا قصیدہ اُن کی
وہ نظمیں پڑھتی ہیں جو مہابھارت اور رامائن کی صورت میں دنیا کے اسٹیج پر نمودار
ہوئیں۔ یہ دونوں قصے عجیب اور اخلاق و شاعری میں آپ اپنی نظیر ہیں
مہابھارت، چندر بنسیوں کا کارنامہ اور رامائن، سورج بنسیوں کا دوسرا شاہنامہ ہے!
مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں۔ اس کی تہذیب و ترتیب میں
متعدد دماغ لگے ہیں۔ اور صدیوں کی کوشش و کاوش کے بعد یہ اس درجہ
تک پہونچی ہے۔ ہر زمانہ کا ممتاز شاعر و فلسفی اپنا دینی فرض سمجھکر اسکی خدمت
کرتا رہا ہے۔ اور یہ سننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مذہبی دفتر کی تدوین میں
غیر آریوں کا نجس ہاتھ بھی لگا رہا ہے۔ جسے ہم بھاشا کے ذکر میں ذرا وضاحت سے
بیان کریں گے!

ایسی محنت کے بعد یہ جامع ضخیم و لاجواب نظم دنیا کے سامنے پیش ہوئی
اور کئی ہزار برس سے اپنا مقابل ڈھونڈھ رہی ہے! رامائن۔ والمیکی کی بے مثل
فکر کا بہترین نتیجہ اور ۲۴ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے!

دنیا کی اور مشہور و معروف نظمیں جن کی زبان و خیالات پر کسی ملک
و قوم کو فخر و ناز ہو سکتا ہے اور جن کے ذریعے سے ہمارے دماغ و مزاج کی

پرورش و اصلاح ہوئی اور جو مہا بھارت و راماین کے ساتھ پیش کیجا سکتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہومر (یونانی) کی ایلیڈ کئی سال کی محنت اور ۱۶ ہزار اشعار میں لکھی گئی۔

(۲) ورجل (لاطینی) کی ای نیڈ دس ہزار شعروں پر ختم ہوئی۔

(۳) فردوسی (فارسی) نے شاہنامہ تیس برس خون جگر کھا کر ؎

بسے رنج بردم دراں سال سی     عجم زندہ کردم دراں پارسی

سلطان محمود کے زمانہ میں ۶۰ ہزار شعروں پر ختم کیا اور اس سے پارسیوں کی داستان باستان ہی زندہ نہ ہوئی بلکہ ایران جی اٹھا۔ اور ایرانیوں[۱] بلکہ کل فارسی داں ممالک و اقوام کا اس سے دماغ روشن ہوگیا!

---

[۱] نقل ہے کہ فتح علی شاہ قاچار اور روس کے درمیان ایک مرتبہ سخت جنگ ہوئی۔ فوجیں سرحد پر پڑی تھیں اور ایک شہزادہ کمان کر رہا تھا۔ روسی مغلوب ہوتے تھے۔ ایک رات حسب معمول شہزادے کی صحبت میں شاہنامہ پڑھا جانے لگا۔ داستان گو حسن وقت ان اشعار ؎

چو فردا بر آید بلند آفتاب     من و گرز و میدان و افراسیاب

چنانش بکوبم زگرز گراں     چو پولاد کوبند آہنگراں!

تک پہونچا شاہزادہ جوش شجاعت میں اٹھ کھڑا ہوا اور خیمہ سے نکل کر اسی وقت دشمن کی فوج پر دھاوا کر کے انہیں پسپا کر دیا! (ناسخ التواریخ و تاریخ آل قاچار)

(۴) شیکسپیر (انگریزی) نے اپنے بے نظیر ڈرامے، ملکۂ الزبتھ کے عہد میں تیار کئے۔ ان ڈراموں نے انگلستان کو ادب سکھایا اور انگریزوں کو مہذب بنا کر دنیا میں بڑھایا!

(۵) انیسؔ (اردو) نے اپنے مراثی پچاس برس کی عرق ریزیوں کے بعد اتمام کو پہونچائے۔ ان کا کلام اسّی نوے ہزار اشعار سے کم نہیں اور اور ہندوستانیوں[۱] کے ادب و اخلاق کی درستگی میں مہا بھارت و رامائن سے کچھ کم حصہ اس نے نہیں لیا ہے۔!

دنیا کے ان ساتوں، ممتاز و زندہ جاوید فلسفی و شعراء و معلمین اخلاق کے دماغوں کی ایک سی ساخت معلوم ہوتی ہے۔ انہیں زبان پر ایسی قدرت اور

---

[۱] شیخ محمد جان شادؔ (مشہور شاعر لکھنوی) مرحوم ناقل تھے کہ غدر کے زمانہ میں میں پار (لکھنؤ) میں رہتا تھا۔ ضرورتاً ایک صبح کو قیصر باغ کی طرف آنا پڑا۔ انگریزوں اور باغیوں کی توپیں چڑھی تھیں۔ بیلی گارڈ کا محاصرہ تھا۔ اس طرف سے جانے لگا۔ ایک بھنگی ہاتھ میں جھاڑو لئے کچھ سوچ میں کھڑا تھا مجھے دیکھکر بولا کہ میاں صاحب جان کی خیر مناؤ۔ ادھر نہ جاؤ۔ میں نے کہا کیا خیر ہے؟ جواب دیا کہ گورے کمک کو آچکے۔ ہولاک اور جنرل اُٹرم بھی آ ہی چلے اور کیا کہوں ؂

لاکھوں میں، کوئی قبل کوئی بعد آئے گا — گیتی ہلے گی، جب پسر سعد آئے گا! (انیسؔ)

جہاں کے بھنگیوں کا ادب و مذاق اتنا درست ہو گیا ہو۔ وہاں کے شائستہ کیسے ہوں گے؟ اور یہ انیسؔ کی زبان و شاعری کا صدقہ تھا!

ان کے خیالات میں اس درجہ وسعت نظر آتی ہے کہ ان کا کلام انسانی طاقت سے باہر معلوم ہوتا ہے اس ملک کی نشو ونما و پرورش میں لٹریچر (ادب) کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اس میں مہا بھارت کو اولیت حاصل ہے۔ اس لئے اب ہم اس داستان کا خلاصہ پہلے پیش کرتے ہیں۔ اور پھر ملک و قوم پر اس کے اثرات کو بتا سکیں گے۔

مہا بھارت۔ راجہ بھرت کی اولاد میں پانڈو اور دھرت (دھرت راشٹرا) دو بھائی ہیں۔ پانڈو اپنا راج پاٹ، دھرت کو دے کر جنگل میں نکل جاتے ہیں۔ ان کے سو بیٹے (کورو) اور پانڈو کی پانچ اولاد (پانڈے) ہیں راجہ دھرت بھتیجوں کے ولی بن کر نیک نیتی سے راج کرتے اور اپنے بڑے بھتیجے یدھشٹر کو یوراجہ (نائب ولیعہد) بناتے ہیں۔ کورو اس پر جلتے اور پانڈو کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اور یہیں سے بھائیوں کا بگاڑ چلتا ہے۔

کورو پانڈو کو نکلواتے اور جنگل میں ڈھکیلتے ہیں۔ وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور ان کے ٹکنے کا جھونپڑا تک جلا دیتے ہیں۔ پانڈو جان لے کر بھاگتے اور آخر راجہ دروپد کے ملک میں پناہ لیتے ہیں وہاں سویمبر[1] کی رسم

---

[1] سویمبر (سویم = پسند۔ بر = دولھا) اگلے زمانہ میں یہاں کے راجاؤں میں دستور تھا کہ جب لڑکی (کماری) سیانی ہوتی تو اسکی خبر کرتے۔ ملک ملک کے کمار اس راجہ کے گھر آتے ایک دن مقرر ہوتا جہاں سب جمع ہوتے اپنی طاقت کا امتحان دیتے۔ ان میں جو پاس ہوتا اس کے گلے میں راجکماری بھرے جلسہ میں پھولوں کا ہار پہنا کر اسے اپنا شوہر بنا لیتی!۔

ادا ہوتی ہے۔ میدان میں ایک لمبی کڑی کھڑی ہے۔ اس کے سر پر ایک چرخی گھوم رہی ہے۔ چرخی کے بیچ میں سونے کی ایک مچھلی لٹکی وہ بھی اُس طرح چکر کھا رہی ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ ایک طرف ایک کڑی کمان دھری ہے شرط ہے کہ جو اُس کا چلّا چڑھائے اور پہلے ہی نشانہ میں مچھلی کی آنکھ اڑا ئے (چھیدے) وہ راجہ کی خوبصورت بیٹی دروپدی کو پائے!

ملک ملک کے شہزادے اور دور دور کے کماؤ آئے ہوئے ہیں۔ مگر اس فولادی کمان کو دیکھ دیکھ کر کانپتے اور نشانہ کے خطا ہونے کی رُسوائی کو یاد کرکے تھراتے ہیں۔ کسی کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ سب مورت بنے کھڑے ہیں آخر پانڈوں میں سے ارجن اُٹھتا، کمان اُٹھاتا، چلّہ چڑھاتا، نشانہ لگاتا اور اس مچھلی کو گراتا ہے۔ اس پر دربار دھک سے ہو جاتا اور جلسہ سناٹے میں آجاتا ہے۔ دروپدی بڑھتی آگے آتی اور اپنے جیتنے والے کے گلے میں ہار پہنا کر اس کی ہو جاتی ہے!

اس کا چرچا پھیلتا اور کوروؤں کو اور بھی حسد ہوتا ہے۔ مگر راجہ دھرت منصف ہیں۔ بھتیجوں کی قدر کرتے بلاتے اور آدھا راج پاٹ ان کو لکھ دیتے ہیں۔ پانڈے چچا کے پیر چوم کر رخصت ہوتے اور ایک جنگل کو صاف کرکے اسے اندر پرست[1] (دلی) بناتے اور اپنی بستی الگ بساتے ہیں۔

---

[1] اندرپرست (اندر پرستھا) دلی کا بہت پرانا نام ہے۔ اندر عیش کے دیوتا ہیں اور پرستھ یعنی اونچی چورس زمین۔ یعنی عیش گاہ!

سب طرف امن چین ہے۔ مگر کورو آرام سے نہیں۔ اندر پرست کا شہر اور پانڈو کا نام سن سن کر اور بھی جلتے ہیں۔ انہیں دعوت دے کر بلاتے اور کسی طرح یدھشتر کو بہکا کر انہیں (پانڈو) جوے پر لگاتے اور دغا کا پاسا پھینک کر سب کچھ ان کا چھین لیتے ہیں۔ جواری کی جھل مشہور یدھشتر اب بھائیوں پر بازی لگاتے اور ایک ایک کر کے انہیں بھی ہار جاتے ہیں۔! مطیع بھائی اُف نہیں کرتے اور بڑے کا حکم خدا کے فرمان کی طرح مانتے ہیں! کورو اس پر تالیاں بجاتے، خوشی کا نرسنگھ پھونکتے، آوازے کستے اور یدھشتر کو تیہا دلاتے ہیں!

ہار جُواری جان پر کھیلتا ہے۔ یدھشتر اب اپنی جیتی اور جیتی ہوئی رانی دروپدی (جو پانچوں بھائیوں کی بیوی ہیں) کو داؤ پر رکھ دیتے ہیں! پاسہ بدی کر رہا ہے۔ کسی طرح نہیں پلٹتا۔ اور یدھشتر آخر انہیں بھی ہار کر اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔!

کورو دروپدی کو ذلیل کرتے، ان کے بال پکڑ کر کھینچتے اور اُس بھری محفل میں انہیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔

راجہ دھرت اب تک چپ تھے مگر عورت ذات اور گھر کی عزت اور بھتیجوں کی ناموس کو اس طرح نہ دیکھ سکے۔ جُوئے پر ملامت کرتے، بیٹوں کو ڈانٹتے، بھتیجوں کو جھڑاتے اور اُن کا راج اُن کے حوالے کر کے رخصت کرتے ہیں

کورو اب بھی نہیں بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں بعد، سادہ دل یدھشتر کو پھر پھانستے اور جوئے کا دام پھر بچھاتے ہیں۔ کورو جیتتے اور پانڈے

پھر ہارتے اور آخر بارہ برس کی بن باس لیتے ہیں۔

اس میعاد کے گذرنے اور دنیا کی ٹھوکر کھانے کے بعد پانڈے سنبھلتے اور ایک جرار لشکر لے کر کوروؤں پر چڑھتے ہیں وہ بھی اپنی ٹڈی دل فوج لیکر اُدھر سے بڑھتے ہیں۔ ملک بھر کے راجہ سمٹ آتے اور ادِھر یا اُدھر ہو جاتے ہیں اور ہستناپور[1] کے میدان میں بھائیوں بھائیوں میں (مہابھارت کی) لڑائی چھڑ جاتی ہے۔ دونوں فوجیں بھڑتی، ٹکراتی اور دنیا سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ اٹھارہ دن آسمان چکّر میں۔ اور زمین بھونچال میں رہی وہ خاک اڑی کہ سورج زرد اور چاند گرد ہوگیا۔ یدھشٹر[2] کے نیزے نکل کے گھوڑے، سہدیو کی تیغ، بھیم کے گرز اور ارجن کے تیروں اور پھر سری کرشن جی[3] کی دعاؤں نے دشمن پر آگ برسادی۔ وہ رن پڑا کہ الاماں! کورو ساتھی سمیت کھیت رہے اور پانڈے مردی کا نشانہ اڑاتے ہستناپور پہنچے اور سارے راج کے مالک ہوگئے

بڈھے راجہ بھرت اب تک جی رہے تھے۔ مگر بیٹوں کے غم میں اندھے اور چور چور ہوگئے تھے۔ دل کسی حال بہلتا اور ٹھہرتا نہ تھا۔ آخر بی بی اور بھاوج کا ہاتھ پکڑ جنگل کی طرف نکل گئے اور وہاں پاؤں پھیلا کر ہمیشہ کیلئے سوگئے

---

[1] ہستناپور کے کھنڈر دلی سے ۲۵، ۳۰ کوس (اتر، پورب) اب بھی دکھائی دیتے اور یدھشٹر کی اس راج دھانی کو یاد دلا کر مہابھارت کی مشہور لڑائی کا نقشہ پیش کر دیتے ہیں [2] یہ پانچوں بھائی ان پانچ فنوں میں طاق سمجھے جاتے تھے۔ [3] سری کرشن جی دیوتا بھی ہیں اور پانڈوؤں کے رشتہ دار بھی۔ اس لڑائی میں ان کی ادھر موجودگی فتح کی ضامن تھی

یہاں پانڈے گو راج رچ رہے ہیں مگر دل چین سے اور دماغ آرام سے نہیں۔ ایسی لڑائی اور ایسے خون کا سماں ہر وقت آنکھوں میں پھر تا ہے جی چھوٹا اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایک دن دنیا کی بے ثباتی کا ذکر نکلا اور اُس نے ایسا اثر کیا کہ پانچوں بھائی راج پاٹ چھوڑ فقیری لیتے اور دروپدی سمیت بنوں میں جا رہتے ہیں۔ اور وہاں تپیشیا کرتے اور اندرا کی یاد میں دن گزارتے ہیں!!

اور بھائی تو اس رستے ہی میں گزر گئے مگر یدھشتر اور انکا وفادار کتا کسی طرح جیتے جی اندرا کی جنت تک پہونچے۔ ان کے لئے دروازہ کھلا۔ لیکن بھائیوں اور بی بی کے بغیر انہوں نے اندر جانا گوارا نہ کیا۔ انکی خاطر رکھی گئی۔ اور انکی بخشایش بھی ہوئی۔ مگر یہ اب اپنے کتے کے لئے اڑے ایسا جانور جنت میں کس طرح جاتا؟ یہ عرض قبول نہ ہوئی۔ دونوں رکے اور انہیں وہاں کی خالی ایک جھلک دکھا کر جہنم میں پھینک دیا گیا۔ اُس اکیلی جنت سے بھرے جہنم کو انہوں نے بہتر سمجھا۔ اس حال میں بھی خوش رہے۔ آخر آزمایش اور مصیبت کے دن کٹے قصور معاف ہوا۔ سب کے سب بہشت میں پہونچائے گئے اور یوں دائمی سرور اور حیاتِ ابدی حاصل کر کے مگن ہو گئے!!

یہ مہابھارت کا خلاصہ ہے۔ اس حکایت کے ساتھ بیچ بیچ میں اور قصے بھی نکلتے ہیں اور وہ بھی لطائف و نصائح سے خالی نہیں۔ مہابھارت کو محض بوستانِ خیال تصور نہیں کرنا چاہئے۔ اس میں علم و حکمت کے ذخیرے

ہیں کہ جوہری آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

یہ داستان ہمیں راجہ دھرت کی سچائی اور امانت داری کا سبق دیتی اور باتوں باتوں میں حسد و نفاق اور بھائیوں کی لڑائی کے بد نتیجہ کو ظاہر کرتی ہے۔ سوئمبر کی رسم سے انسان کی فضیلت کا معیار صرف قابلیت کو ٹھہراتی اور عورتوں کو اپنے شوہروں کے انتخاب میں اُن کی جائز آزادی کو سراہتی اور آج سے کئی ہزار برس قبل کی متمدن اور شائستہ ہندی عورتوں کے سوشل درجہ کو بتاتی ہے! پھر جوے کی برائی کو کھول کر اُس کے نتیجہ کو آئینہ کر دیتی ہے۔ یہ داستان، فتح و شکست کو جمعیت سے نہیں بلکہ بہادری سے متعلق کرتی اور سری کرشن جی کا قدم بیچ میں لاکر حق کی فتح کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اتنے قصور کے بعد دنیاوی وجاہت کو ضروری منواتی اور مذہب کے رشتہ سے اُسے وابستہ بتاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اصل زندگی کو بھی کسی حال بھولنے نہیں دیتی ہے۔ اس عالم کو سراب اور یہاں کی واردات کو خواب سے تعبیر کر کے اُس کی وقعت کو گھٹاتی اور راجہ دھرت کو جنگلوں میں لے جاکر اور پھر پانڈوں سے راج چھڑوا کر، آلائش دنیا سے روح کو پاک کرنے کا رستہ دکھاتی ہے! کتے کا ذکر بھی حکمت سے خالی نہیں وفا کا جواب وفا سے دیا جاتا ہے۔ اور اُس کے قائم رکھنے میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنا سکھایا جاتا ہے! اور پھر اس کے صلے میں حیاتِ ابدی اور دائمی سرور عطا کیا جاتا ہے!!

---

مہابھارت کے بعد راماین کا درجہ ہے اور اس لاجواب نظم نے بھی یہاں کے دماغ کی نشو و نما پرورش میں بڑا حصہ لیا ہے اور جب بابا تلسی داس نے یہاں کی خاص زبان یعنی بھاشا میں بھی اس کا ترجمہ کر دیا تو یہ گھر گھر

پھیل کر زبان زد خاص وعام ہوگئی۔ اب اس کا خلاصہ بھی پیش کر کے ملک و قوم پر اس کے اثرات بیان ہوں گے۔

رامائن ۔ کہتے ہیں کہ کوسل[1] کے راجہ دسرتھ کی تین رانیاں تھی اور اُن سے چار اولاد ہوئیں۔ کوسیلا کو اللہ نے رام چندر نام ایک چاند سا بیٹا دیا۔ کیکئی کی گود بھرت سے بھری گئی۔ اور سمیترا کی آنکھ لچھمن اور ستر گھن سے ٹھنڈی ہوئی!

جس باغ میں ایسے پھول کھلیں اس کی بہار کا کیا کہنا یوں تو یہ چاروں کوسل کی زیب اور راج کی زینت تھے مگر رام کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بچے کے پیر پالنے میں۔ اسی وقت سے ان کے آثار دوسرے تھے۔ سب ان پر فدا رہے اور لچھمن تو ان بھائیوں پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ ان دونوں کا نام (رام لچھمن) ساتھ آتا اور ان کے عشق کو بتاتا ہے۔

رام بڑے ہوئے تو اور فنوں کے ساتھ تیراندازی میں بھی ارجن نکلے ایسی ہنر اور شوق انہیں راجہ جنک[2] (متھلا پور) کے سوئمبر تک لے گیا۔ جہاں بھرے

---

[1] کوسل گھاگھرا (دریا) کے کنارے ایک بڑی آبادی تھی۔ اور سورج بنسیوں کی وہیں راجدھانی تھی۔ اس جگہ کا نام بعد کو اجودھیا اور اودھ پڑا۔ اس کے کھنڈر اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے ذرا ہٹ کر فیض آباد آباد ہوا۔ [2] جنک پور۔ سیتا جی کے باپ راجہ جنک کی راجدھانی ترہت (شمالی بہار) کے علاقہ میں یہ ایک مشہور جگہ تھی۔ اسے متھلا پور بھی کہتے ہیں۔

جلسہ میں انہوں نے وہ کمان توڑی جو کسی بشر سے آج تک اٹھی بھی نہ تھی۔ اس کے عوض سیتاجی کو جیت لائے۔ اور وہ حسن و وفا کی دیبی ان کے جان کے برابر رہی!

دستور تھا کہ راجہ بوڑھا ہوتا تو سلطنت کے کام میں کسی لائق بیٹے اور عزیز کو شریک کر لیتا۔ وہ یودراجہ کا خطاب اور اسی وقت سے تربیت پاتا۔ راجہ دسرتھ بھی جب بوڑھے ہوئے تو یودراج کی فکر ہوئی۔ بھائی بند، رشتہ دار، نوکر چاکر، رعیت پر جا آئے گئے۔ سب کی نظر انہیں رام پر تھی۔ راجہ بھی یہی چاہتے تھے۔ مگر رائے سب کی لی۔ اور سب نے ایک منہ ہو کر رام، رام ہی کہا! راجہ شاد ہوئے، بیٹے کو بلا کر خوش خبری سنائی۔ اور اسی وقت سے اس رسم کی ادائیگی اور جشن کی تیاری ہونے لگی!

رنگ میں بھنگ۔ رنواسوں (محلات) میں بھی اس کا چرچا ہوا۔ ہر طرف شادی رچی۔ مگر رانی کیکئی کے گھر ماتم تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ رام آج یودراجہ (نائب) اور کل راجہ بنے تو کوسلا (سوت) کا راج اور میرا بڑا دہاڑا ہوگا۔ اور جب تک بھرت گدّی نہ پائیں، میری کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑیں۔ راجہ رات کو اندر آئے تو رانی کو پڑا دیکھ کر گھبرائے حال پوچھا۔ کچھ نہ کھلا۔ بہت اصرار کیا تو بولیں کہ مہاراج آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو دو باتیں تم چاہو گی ہم پوری کریں گے۔ اس کا وقت آ گیا۔ اب قول پورا کیجئے۔ راجہ کیا جانتے تھے کہ کیا کہا جائے گا؟ جواب دیا کہ ہاں، ہاں، وہ کون سی بات ہے جو تم کہو اور پوری نہ ہو۔ کیکئی تڑپ کر

بولی کہ بھرت کو راج اور رام کو بن باس ملے ۔

بن باس ۔ یہ سن کر راجہ دھک سے ہو گئے۔ صبح ہوئی۔ آج جشن کا دن اور بڑی تیاریاں تھیں۔ شہر میں چہل پہل؛ اور محل میں غل قل[1] تھی۔ دربار تیار اور درباری بے چین کہ مہاراج جلد باہر آئیں اور رام گدی پائیں۔ بڑی دیر ہوئی۔ اندر خبر گئی۔ راجہ نے بیٹے کو بلایا اور ماجرا کہہ سنایا۔ راج کا وارث پاؤں پر گر کر بولا کہ مہاراج زبان ہار چکے! یہ کہتے ہوئے ماں اور بی بی کے پاس گئے۔ حال کہا اور بن باس پر تیار ہو گئے۔ سیتا اور لچھمن انہیں اکیلا کیونکر چھوڑتے۔ دونوں ساتھ ہوئے اور تینوں نکلے۔ محل ویران اور شہر سنسان ہو گیا۔ ایک خلقت ٹوٹی۔ اور اپنے شہزادے کو اشہر کے ناکے تک پہونچا آئی!

راجہ کو غموں نے کھایا اور وہ بھی تمام ہوئے! یہ سب یہاں ہو گیا مگر بھرت کو کچھ خبر نہیں۔ وہ پنجاب میں تھے۔ ادھر سے چٹھی گئی تو گھبرائے اور دوڑے آئے۔ سارا حال سنا۔ بڑا رنج ہوا۔ ماں سے بھی بیزار ہو گئے۔ سب نے گدی پر بیٹھنے کو کہا۔ انکار کیا بھائی (رام) کی ڈھونڈھ میں نکلے۔ چترکوٹ[2] (پہاڑ) پہونچے، ملے۔ گھر چلنے کو کہا۔ انہوں نے باپ (راجہ) کی بات یاد دلائی۔ نصیحت کی کہ قول پورا ہونے میں تم بھی میرا ساتھ دو۔ بھرت چپ ہو گئے۔ چودہ برس بعد

---

[1] غل قل۔ گھما گھمی کے معنوں میں۔ نہ معلوم اور جگہ کیونکر بولتے ہیں۔ ہماری زبان پر یہ لفظ اسی طرح اور انہیں معنوں میں چڑھا ہوا ہے ا [2] چترا کوٹ۔ بندیلکھنڈ کا ایک پہاڑی مقام کوٹ چھوٹے قلعہ کو کہتے ہیں۔ رام چندر جی۔ مدتوں یہاں بھی رہے۔

اجودھیا واپس آنے اور راج لینے کا قول لیکر پلٹے اور بھائی (رام) کی کھڑاوں چوم کر خالی تخت پر رکھی اور انکی طرف سے راج کرنے لگے۔!

# دکھن کا فسانہ

رام، لچھمن، اور سیتا کوسل سے نکلکر پراک (قدیم الہ آباد) اور وہاں سے وھندیاچل کے بنوں میں جا رہے۔ اور پھر چترکوٹ کی پہاڑی پر جو پڑاؤ ڈالکر بیٹھے، جی گھبرایا تو آگے بڑھے۔ جنگلوں کی ہوا کھاتے۔ بناس پتی چباتے بنوں کو صاف اور وحشیوں کو رام کرتے دریائے گوداوری کے کنارے جا کھڑے ہوئے اور اُسے پیر کر دکھن کی چھاتی پر سوار ہوئے اور ناسک[۱] (پنچ وٹی) میں ڈیرے ڈال دیئے۔

یہ علاقہ لنکا (سیلون) کے راجہ راون کا تھا اور اس کے بھائی کھر اور وشن[۲] وہاں کے حاکم تھے۔ سروپ نکھا ان کی بہن اُس علاقہ میں آتی جاتی تھی

---

[۱] ناسک۔ سانسکرت میں نسک، ناک کی جگہ کو کہتے ہیں۔ لچھمن جی نے سروپ نکھا کی یہیں ناک کاٹی اور جب سے وہ جگہ نسک ہوگئی! [۲] فردوسی کے اس مصرعہ کو یاد کرو۔ ع

ماننِد سنانِ گیتو، در جنگ لشن! اور پھر وشن کے قافیہ سے اسے ملاؤ۔ ہند و فارس کے نام تک اس طرح ملتے جلتے ہوئے ہیں اور یہ وہی سانسکرت و ژند کے ایک ہونے کا سبب ہے ایک فلالوجسٹ (ماہر علم اللسان) اس سے بڑے نکتے حل کر سکتا ہے!

پھرتے پھراتے ایک دن اِدھر بھی نکل آئے۔ اور رام چندر جی کو دیکھکر جی جان سے اُن پر عاشق ہوگئی۔ اُس چاند کا چکور بنی مدتوں منڈلاتی اور جان بچھاتی رہی۔ مگر سیتا جی کا گرفتار کیا پھنسا! اُس بھتنی کو یہ ہمیشہ دتکارتے رہے اُس کی دیوانگی حد سے بڑھی تو لچھمن جی نے عاجز آکر اُس چڑیل کی ناک کاٹ اپنی سرحد سے اُسے دور پھینک دیا۔!

سروپ نکھا روتی پیٹتی اسی حالت سے بھائیوں کے پاس پہونچی۔ بہن کا یہ حال دیکھکر بھائی بپھرے اور ایک لشکر لے کر اُن مسافروں پر ٹوٹے اِدھر دو اور اُدھر ہزار۔ مگر یہ (رام لچھمن) جان پر کھیل کر اور دل کھول کر لڑے کھر اور دشن ان کے تیروں سے چھنی ہو کر گرے۔ یہ جیتے اور پھر اس جنگل میں شیر بن کر رہے!

سروپ نکھا کا یہ وار بھی خالی گیا تو اور بھلائی اور دوسرے چرتر پر کمر باندھی۔ لنکا پہونچی۔ آگ لگائی۔ راون سے ملی اور کہا کہ تیرے علاقہ کے بھاگ کھلے۔ لے اندرا کی بیٹی اور حسن کی دیبی زمین پر اتر آئی اور لنک کے جنگل میں منگل منا رہی ہے۔ راجہ ہم نے تو اُسے دیکھتے ہی غش کیا۔ بڑی فکر کی کہ تجھ تک اُسے لائیں۔ مگر دو آسیب اُس کی جان نہیں چھوڑتے۔ بلا کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ ہم عورت ذات اُن سے کیسے جیتتے۔ دیکھ تیرے بھائیوں نے جان اور ہم نے تیرے کارن ناک تک کٹوائی مگر وہ ہاتھ نہ آئی۔ راجہ! اب تم جاؤ۔ اسے لاؤ اور بی بی بناؤ۔ مگر دیکھنا۔ وہ دونوں سانپ ہیں اور عورت بھی ناگن سے کم نہیں۔ ہشیاری سے جانا اور اُسے اڑا لانا!

راون یہ سنتے ہی بے چین اور بن دیکھے سیتا کا عاشق ہوگیا۔ لنکا سے چلا، لنک پہونچا اور فقیروں کا بھیس کر، ایسے وقت سیتا جی کی جھوپڑی تک آیا کہ رام، لچھمن دونوں شکار کو نکل چکے تھے۔ اور وہ باہر زمین پر کنڈل[1] مارے (کہ کوئی دشمن اندر نہ آسکے) اکیلی بیٹھی مالا جپ رہی تھیں۔ یہ پہونچا اور صدا لگائی کہ بھوکھا ہوں۔ راہِ خدا کچھ دیدے! سیتا جی تڑپ گئیں۔ ہاتھ بڑھا کر بھوکے کو روٹی دینے لگیں۔ وہ بولا۔ فقیر کتا نہیں۔ آدمی سے چھوت اچھا جاتا ہوں، یہ بے چین ہوکر حصار سے باہر نکل آئیں۔ اور فقیر کی جھولی بھرنے لگیں۔ موقعہ ملا وہ بھوت انہیں پکڑ، پیٹھ پر لاد، جنگلوں میں گھس گیا۔

## رام لیلا[2]

یہ دونوں بھائی (رام لچھمن) شکار سے آئے تو سیتا جی کو جھوپڑی میں نہ پاکر بہت گھبرائے۔ ڈھونڈھنے نکلے۔ پہاڑ پہاڑ جنگل جنگل، مارے پھرے، پیر میں چھالے پڑے۔ مگر کہیں ٹھکانا نہ ملا اور گھبرائے۔ آخر کسی طرح اصل حال کھلا اور یہ دونوں لنکا کو پھونکنے نکلے! لنک سے اُتر کر راجہ سگریو (سگریو

---

[1] کنڈل مارنا۔ منتر یا دعائیں پڑھ کر زمین پر ایک دائرہ (سرکل) کھینچتے اور اسکے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی کو حصار کھینچنا بھی کہتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس کے اور اندر بھوت پلیت (پلید) اور دشمن نہیں آسکتا! [2] رام لیلا۔ لیلا بمعنی تماشہ۔ یہ کھیل سارے ہندوستان میں سالانہ ہوا کرتا ہے۔

غیر آریا) کا علاقہ تھا۔ وہ ان پر مہربان ہو گیا۔ اور کوسل کا راجہ مان کران کی بڑی آؤ بھگت کی۔ حال سن کر فوج دی۔ اور ہنومان[1] کو سالار بنا کر ساتھ کیا سب نکلے۔ سمندر کنارے پہونچے۔ پانی زمین کاٹ کر ہند و لنکا کو دو کئے ہوئے تھا۔ ہنومان نے پل باندھ کر ایک کیا۔ فوج ادھر چھوڑ کر اُدھر اترا اور سیتا کی خبر لینے چلا۔

وہاں راون نے سیتا کے لئے نیا محل اور باغ بنوا کر اس میں انہیں بکاؤلی کے پھول کی طرح رکھا تھا۔ اُن کے پاس جاتا عشق جتاتا، دام بچھاتا، وہ جس سے سب کاٹتیں۔ اسے گرفتار رکھتیں۔ مگر آگے نہ بڑھنے دیتیں۔ اور رام کی یاد میں بیٹھی دن گزارتیں!

ہنومان اُدھر پہونچا۔ بھیس بدل کر کسی طرح اس محل میں گھسا۔ سیتا جی سے ملا۔ حال کہا۔ اُن کے بیٹھے ہوئے دل کو اُٹھا کر لوٹا۔ اور رام سے سارا قصہ کہا۔ اب ادھر سے فوج چلی۔ لنکا پر چڑھی۔ راون بھی نکلا۔ لڑائی چھڑی اٹھارہ دن رات خون کی ندی بہی۔ سگدیو کی فوج اور راون نے بڑا کام کیا۔

---

[1] اس زمانہ میں آدمیوں کے نام بھی۔ اکثر جانوروں کے نام پر ہوا کرتے تھے ہندوستان ہی میں نہیں، ایران و شام میں بھی اس کا رواج تھا۔ خاندانوں کے نام جیسے ناگ بنسی، والمیکی نے ایسے ناموں سے شاعرانہ انداز پیدا کرلئے

لنکا میں جو[1] تھا سو باون گز کا، مگر اب بالشتیوں[2] سے بڑھ کر نہ تھے۔ سب ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ ایک جیتا نہ چھوٹا۔ راون بھی گرا اور خاک میں ملا۔ لنکا میں آگ لگی، سارا شہر جلا اور پھنکا! رام لچھمن ہنستے محل میں آئے۔ سیتا بال کھولے کھڑی اُن کے لئے دعا کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا ملے خوشی کے آنسو برسائے۔ رانی کاڈولا اپنی فوج میں لائے! ہنومان کی پیٹھ ٹھونکی، راجہ سگدیو کا شکریہ ادا کیا۔ چودہ برس کٹ چکے اور مصیبت کے دن نکل چکے تھے دکھن کو سلام اور غیر آریوں کو رخصت کر کے دونوں بھائی رانی سمیت کوسل کو چلے کہ بھرت سے ملیں اور وعدہ پورا کریں۔

## بھرت ملاپ!

خبر چھپی نہ رہی۔ کوسل نے بھی پردیسیوں کی واپسی کا حال سُنا۔ کوسیلا جی اُٹھیں۔ بھرت شادیٔ مرگ ہو گئے۔ سارے شہر میں ایک عید تھی۔ مندروں شوالوں میں گھنٹے بجتے۔ ایک دوسرے سے ملتے اور مبارکی دیتے۔ بھرت سب کو لے کر بھائی سے ملنے نکلے۔ سارا شہر ٹوٹا۔ آدمی پر آدمی

---

[1] لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ شاید جب ہی سے یہ مثل چلی آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم قدآور اور گراں ڈیل تھی۔ اور جب ہی دیو لقب ہوئے۔

[2] بالشتئے لنکا والوں کے جواب میں یہ بھی شاعرانہ پہلو لئے ہوئے ایک قوم مانی گئی ہے۔ جیسے انگریزی میں لِلی پوتیں۔

گھوڑوں پر گھوڑے، رتھ پر رتھ، پیچھے پیچھے، گیندا (پھول) اچھالتے، اَبیر[1] اڑاتے ناکہ تک پہونچے، رام لچھمن ادھر سے بڑھے۔ بھرت دوڑے۔ بھائی کے پیر چومے۔ انہوں نے اٹھایا، گلے لگایا۔ اور اب تینوں ایک رتھ میں بیٹھے اور سیتا کو دوسری میں بٹھا، سونے کے پھول مٹھیوں سے پھینکتے، زر اچھالتے، جواہر وارتے محل تک پہونچے۔

کوسلا دوڑیں، سمیترا بڑھیں، کیکئی بھی آئیں۔ سب ملے روئے اور پھر جشن تازہ ہوئے۔ محل سجایا یا اور دربار لگایا گیا رام آج گدّی پائیں گے۔ بڑی بھیڑ بڑا جماؤ اور بڑی گھما گھمی تھی۔ رام، لچھمن، بھرت، سترگن چاروں بھائی ساتھ آئے۔ اپنے اپنے عہدوں سے بیٹھے۔ بھرت بڑھے۔ بھائی (رام) کا ہاتھ پکڑ مسند تک لائے۔ بٹھایا! مبارک سلامت کی دھوم مچی سنکھ پھکنے اور گھنٹے بجنے لگے۔ اس دھوم دھام میں راجہ دسترتھ سب کو یاد آ گئے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ان کے چرچے بھی رہے۔ برہمن بھی آئے۔ راجہ (سرگ باشی) کے نام پر دان ہوا۔ اور پھر ریت رسم ادا ہونے اور خوشی کے باجوں سے مستی چھانے لگی۔ چھٹی ہوئی تو ایک گھوڑا لایا اور بل[2] دیا گیا۔ اور دربار برخاست ہوا۔

---

[1] ۔ ابیر۔ الف سے اس کا اَملا ہو تو ہندی اور عین سے عربی لفظ ہے۔

[2] ۔ کسی بڑی کامیابی اور خوشی کے موقعہ پر گھوڑے کی قربانی (بل) کا رواج تھا۔

# سیتا جی!

چودہ برس بن میں رہ کر اور دنیا کی کڑیاں جھیل کر، رام چندر اور سیتا جی اور بھی پکے اور ایک دوسرے کے غلام ہو گئے تھے اور بڑے چین سے رہتے تھے۔ مگر زمانہ کا بُرا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ملک میں ایسا ہا کال پڑا کہ اناج خواب ہو گیا۔ اور آدمی آدمی کو کھانے لگا۔!

راجہ (رام چندر) گھبرائے۔ پنڈتوں، جوتشیوں کو بلایا۔ پوچھا کچھ نہ کھلا ہارے تو لگے وجہ آپ سوچنے۔ جنگل کے دن اب تک یاد تھے۔ وہاں کا خیال آتے ہی راون کی تصویر سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس تصویر میں وہ باغ بھی نظر آیا جہاں سیتا جی نظر بند تھیں۔ اُس باغ اور اُس قید نے بڑے شک ڈالے اور سیتا کی طرف سے دل میں کھٹک سی ہو گئی! اور ایسے کال کو اسی کا نتیجہ اور اُدھر کا غصہ سمجھے! اندر آئے۔ رانی (بی بی) کو بلایا۔ پوچھا۔ قسم دلائی۔ وہ جو چودہ برس ان کے لئے بن باس رہی ہو، ایسی بات کا کیا جواب دے؟ منہ دیکھتی رہیں! مرد کا غصہ تو بہ اُف۔ آگ میں ڈالی گئیں! بے لاگ نکل آئیں۔! اس پر بھی یہ (رام) ٹھنڈے نہ ہوئے۔ اُن کو بن باس کا حکم ملا۔ رانی اکیلی جنگل میں پہونچائی گئیں۔ وہاں رہیں۔ دن پھرے تو گھر آئیں کوئی شکایت زبان پر نہ لائیں اور پھر میاں بی بی اسی طرح ہنستے بولتے اور اچھے دن گزارتے رہے!!

یہ خلاصہ والمیکی کی اصلی تصویر کا تو کیا، ہاں دور سے اسکی ایک جھلک دکھا سکتا ہے۔ رامائن چھ حصوں میں ہے۔ اس کے پہلے دو حصے شمالی ہند کے آریا راجاؤں کے یہاں قیام و سلطنت اور خصوصاً سورج بنسیوں کے ذکر خیر پر وقف ہیں۔ باقی حصوں میں دکھن کی سرگذشت، غیر آریاؤں سے ملنا، ان کی کمک اور ان سے لڑائی اور پھر راون سے جنگ۔ لنکا کی فتح اور شمال و دکھن کے تعلقات قائم ہو جانے کا حال اور پھر سیتا جی کے قابل تقلید کیرکٹر کا صراحت سے بیان ہے۔

یہ قصہ راجہ دسرتھ کی سلطنت میں عام مشورے کی شرکت دکھا کر اس وقت کے طرزِ حکومت کو واضح کرتا ہے۔ اور رانی کیکئی کے پردے میں تریا ہٹ اور سوتیا جلن کو دکھاتا اور رام کے لباس میں زبان کا پاس اور وعدہ کی پابندی کا سبق دیتا ہے۔ اس حکایت میں لچھمن ہم کو بھائیوں کے سلوک و مدارا، اور آپس کی وہ اگلی محبتیں اور بے ریا خدمتیں یاد دلاتے ہیں۔ جو اب خواب ہو گئیں! بھرت باپ کا ادب اور بڑے بھائی کا پاس سکھاتے اور سلطنت و خاندان کے حفظ کی صورت بتاتے ہیں۔ رانی کوسلیا، شوہر کی بات پر ایثار و صبر دکھاتی اور بیٹے کو جنگل میں رخصت کر کے نفس کشی کا سبق پڑھاتی ہیں!

دکھن کا فسانہ بہت دور لیجاتا اور آریا و غیر آریا میں ارتباط اور اسکی مضبوطی کا حال کھولتا۔ اور اس سے دونوں طرف (شمال و دکن) جو اثرات پڑے اسے واضح کرتا ہے!

اس فسانہ کی اصل ہیرو، سیتا جی ہیں۔ اور والمیکی نے انہیں محض ایک دیبی کے پیکر میں نہیں بلکہ ایک معمولی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ راجہ کی بیٹی، راجہ کی بہو اور کمار کی بی بی ہیں۔ اور بڑے ناز و نعم کی پلی ہیں۔ مگر شوہر پر برا وقت آتا تو منہ نہیں موڑتیں اور اس کے لئے ہر کڑی اٹھانے پر کھڑی ہو جاتی ہیں! دکھن میں ظالم راون کے قابو میں ہیں۔ مگر اسے پھنسائے اور خود کو ہر طرح بچائے رکھتی ہیں۔ اور اس سے اپنی عقل و مذہب کا ثبوت دیتی ہیں۔

اس قصہ کا اخیر حصہ بھی کچھ کم دلکش اور سبق آموز نہیں۔ سیتا جی شوہر کا بیجا غصہ اٹھاتیں اور ان کے غلط فیصلہ کو سر جھکا کر مانتی ہیں اور راہ محبت میں اُف نہ کرکے دنیا پر اس محبت کا راز کھول دیتی اور چلنے والوں کے لئے اپنا نقش قدم چھوڑ جاتی ہیں!!

---

مہابھارت و رامائن کا مجموعی اثر۔ مہابھارت و رامائن دونوں سنسکرت میں تھیں۔ اس لئے عوام پر ان کا کافی اثر پڑنا مشکل تھا۔ تقریباً ڈھائی سو سال قبل مسیح سے یہاں (ہند) ایک دو طرح کے حروف ایجاد ہو گئے تھے۔ اور ان میں کچھ تحریر بھی ہوا کرتی تھی۔ مگر عام طور پر لکھنے کا رواج نہیں[۱] ہوا تھا۔ برہمن مذہبی کتابوں کی تحریر سے زیادہ ان کا حفظ کر لینا

---

[۱] ویبر۔ مشہور جرمن لکچرار۔

پسند کرتے تھے۔ اور نظم کی وجہ سے یہ آسان بھی تھا۔ انہوں نے مذہبی رسموں اور شادی غمی کی روایتوں میں ان (مہا بھارت و رامائن) کے منتر سے اور اشلوک پڑھنے کا رواج ڈالا۔ اور چوں کہ ان میں مذہبی خصوصیات کے ساتھ عمدہ پیرائے میں نصائح اور دلکش قصے اور اور لطائف بھی تھے اس وجہ سے انکی طرف رغبت ہوتی چلی اور خاص موقعوں کے سوا یوں بھی وہ دہرائے جانے لگے۔

ان پنڈتوں کی تقلید پر یہاں ایک اور فرقہ کھڑا ہوا جو بھاٹ[1] کہلاتا تھا۔ یہ نیچے طبقے کے لوگ اور زیادہ تر غیر آریا اور عوام تک بآسانی پہونچ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی ان منتروں کو یاد کیا اور گھر گھر اور گلی کوچوں میں خاص لے اور دھن میں انہیں پڑھنا اور اپنی زبان میں ان کا ترجمہ و مطلب بیان کرنا اور اس طرح کما کھانا شروع کر دیا۔ اس طرح ان نظموں کے الفاظ و فقرات زبان زد ہو کر دلوں میں گھر کرتے اور اس راہ سے دماغی نشو و نما میں خاص حصہ لیتے اور اس ملک کا کیرکٹر بناتے رہے۔

مہا بھارت زیادہ تر مذہبی رنگ لئے ہوئے، آپس کی جنگ کا کارنامہ تھی۔ اور رامائن، زیادہ تر، قصوں، لطیفوں، اور چٹکلوں کا گلدستہ بلکہ گلستاں و بوستاں اور پھر غیروں سے لڑائی اور ان پر فتح کا دوسرا شاہنامہ تھی! اس وجہ سے وہ زیادہ مقبول ہوئی اور یہاں کی غیر آریا

---

[1] یہاں وہ بھاٹ، بگڑ کر بھانڈ بنے اور وہاں انگریزی میں بارڈ (Bard.) ہو گئے!

یعنی اصلی ملکی زبانوں میں اس کے الفاظ بھی پھٹنے لگے۔ سنسکرت یہاں کی زبانوں پر ثقیل تھی؛ ان دونوں نظموں کے عام ہونے سے ان کے الفاظ یہاں کے لب و لہجہ کے موافق بننا اور زبان پر چڑھنا شروع ہو گئے اور اس سے (بہ ظاہر) ایک نئی قسم کی زبان پھیلنے لگی جسے عرف عام میں سنسکرتی بھاشا یا مہا بھاشا کا لقب پڑا جو ممتاز غیر آریوں کی زبان سمجھی گئی اور جسے آریا، بلکہ برہمن تک بولے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

رامائن یہاں کی خاص زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی۔ ہندو دھرم اور سنسکرت کے مٹنے پر جین مت[1] نے ان دونوں نظموں کو بہت سنبھالا اور

---

[1] جین مت اور بودھ مت کے بانی گو دو ہیں مگر دونوں متوں کی روایت و حکایت ایک ہے۔ بودھ مت شمال ہند میں پھیلا اور جین مت وسط ہند و دکن میں رائج ہوا۔ بودھ مذہب یہاں سے مٹ گیا مگر جین مت زندہ اور ہمارے مارواڑیوں کی بدولت اب تک دھنی ہے! مالوا (اجین) شروع میں اس مت کا مرکز رہا۔ اودھ کے راجہ قوماً، عموماً تاتاری (غیر آریا) تھے۔ مشہور بکرماجیت اور راجہ بھوج اس مت کے پیرو تھے جن کے علمی ذوق و شوق اور فیاضیوں کی بدولت مالوا ایک زمانہ میں دارالفنون اور بھاشا کا دلی و لکھنو بنا رہا!!

دکن و اطراف دکن اور خصوصاً درویدی زبانوں (مثل کناڑی[1] وغیرہ) میں ان کا ترجمہ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ دونوں قصے مستقل طور پر وہاں بھی کہے گئے اور اُدھر کے لٹریچر (ادب) کا سرمایہ ہو گئے۔

ادی پمپا، اس عہد (جینی زمانہ) کا ایک ممتاز شاعر ہے اس نے پمپا بھرت (مہا بھارت کا جواب) لکھ کر چندر بنسیوں کا نام اُدھر بھی روشن کر دیا۔ اور پھر وہاں والمیکی کے جواب میں ایک دوسرا نامی شاعر انجی پمپا (دوم) کھڑا ہوا جس نے اپنی پمپا رامائن سے، سورج بنسیوں[2] کو اُدھر بھی چمکا دیا

---

[1] کناڑی غیر آریا۔ اور درویدی زبانوں کی ایک شاخ (مثل تامل، تلنگی اور ملائی) اتنے انقلابوں کے بعد بھی اب تک یہ بھاکھا زندہ اور ریاست میسور کے ایک خاص حصہ میں رائج ہے۔ یہ ریاست اس وقت اس کی ترقی میں کوشاں اور اُسے زبان (Language) کے درجہ تک لانے کی کوشش کر رہی ہے

[2] یہ دونوں شعرا اپنی اپنی نظموں میں قدیم مہا بھارت اور والمیکی کی رامائن کے مضامین سے اکثر اختلاف کرتے ہیں۔ پمپا اپنی رامائن میں دکھن کے راکسوں (راکشش) کو برخلاف والمیکی کے ایک خاص عنصر کا مخلوق بتاتا ہے اس کے نزدیک کھچارا اور بھچارا (جن وانس!) دو طرح کی خلقت اس زمین پر ہے ایک زمین پر چلتی پھرتی دکھائی دیتی (انس) اور دوسری ہوا پر اڑتی (جن) اور نظروں سے غائب رہتی ہے! پمپا کے خیال میں ہنومان، لنکا پر پل باندھکر نہیں اترے بلکہ یہ کھچارا تھے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ پر دیکھئے)

سنسکرت کا چراغ جب ادھر (شمال میں) ٹمٹمانے لگا اور اس وجہ سے یہ قصے بھی سرد ہونے لگے تو آخر بابا تلسی داس[1] نے انہیں اپنی بھاشا میں لاکر پھر گرم کردیا۔ اس سے اصل چیز مٹنے ہی سے نہ بچ گئی بلکہ اب وہ یہاں کی بہتی زبان میں آکر اور زیادہ محبوب و مقبول ہوگئی۔ اور اسکی

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸)

جو فوج کو ہوا پر اڑا کر اس طرف لے گئے! پمپا منو مان کو (برخلاف والمیکی کے) سچ مچ کا بندر نہیں مانتا۔ بلکہ کہتا ہے کہ انکی فوج کے نشان پر بندر کا مارکہ تھا اور اس سے وہ قوم اس طرح سمجھ لی گئی! وہ (پمپا) راون کے دس سروں کا بھی قایل نہیں۔ کہتا ہے کہ جس کمرے میں وہ (راون) پیدا ہوا اس میں آینے (آئینے) جڑے تھے۔ اس کے عکس سے ایک سر کے دس سر نظر آتے تھے۔ اس حجت سے راون دس سروالا مشہور ہوگیا!! (کناری لٹریچر۔ از پرائس)

[1] ۔ بابا تلسی داس ان کا زمانہ مغلوں کا شروع عہد ہے۔ جب سنسکرت تو کب کی رخصت ہوچکی، بھاشا بھی اپنی کیچلی اتار کر خول بدل چکی اور اردو بننے کے لئے تیار ہو رہی تھی! تلسی داس نے رامائن کا خلاصہ کیا اور اس بان میں اپنی رام کہانی سنائی جو اس وقت کے ہندو عوام کی بھاکھا تھی اسکے علاوہ ملک میں اس زبان کا درجہ بلند ہوچکا اور وہی بھاشا جس طرح سنسکرت کے اثر سے سنسکرتی بھاشا یا جھابھاشا بنی تھی اسی طرح اب وہ عربی و فارسی کے اثر سے فارسی بھاشا کہے جانے کی مستحق تھی (بقیہ حاشیہ ۱۵۰ پر دیکھئے)

کتھا دماغوں میں جگہ پکڑنے اور اپنی روشنی پھیلانے لگی! اس طرح یہ دونوں نادر افسانے کئی ہزار سال کی گردش کے بعد بھی تباہی سے بچے اور انقلاب کے پنجے سے محفوظ چلے آتے ہیں۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹:)

اور اب جیسے زود فہم، ہندو و مسلمان دونوں بول رہے تھے! بابا تلسی داس نے معمولی لوگوں اور عوام کے لئے اپنی رامائن لکھی اور پھر والمیکی کی تقلید بھی فرض اور اس کی شاعری و تخیل کی پیروی بھی واجب تھی اس وجہ سے وہ ٹھیٹھ ہندی کے بولنے پر مجبور تھے۔ اس پر انکی رامائن عربی اور خصوصاً رائج فارسی لفظوں کا ایک فرہنگ بن گئی! باباجی نے اکبر کا زمانہ بھی دیکھا اور نورتنی مجلس میں کئی بار انہیں جگہ بھی دیگئی اور ان کی رامائن کی قدر کی گئی!!